سہ ماہی

ادبی نشیمن

مارچ تا مئی ۲۰۱۸ء

قیمت: ۲۰/روپے



ایڈیٹر

ڈاکٹر سلیم احمد

جلد نمبر: اول　　شمارہ نمبر: ۲

اردو ادب کا ترجمان

سہ ماہی ادبی نشیمن لکھنؤ

مارچ ۲۰۱۸ تا مئی ۲۰۱۸

ادبی صلاح کار

رفعت عزمی

موبائل نمبر- 9451818310

مدیر اعزازی

ڈاکٹر سلیم احمد

saleemahmad110@gmail.com

موبائل نمبر 9415693119

تزئین کار : محمد رضا مبارکپوری

Email:

adbeenasheman@gmail.com

فی شمارہ : ۲۰ روپے

سالانہ زرتعاون : ۷۵ روپے

بذریعہ ڈاک (انڈیا) : ۱۰۰ روپے

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر، سہ ماہی ادبی نشیمن، ۵۴۴-سی/۱۶۸/الماس باغ،

ہردوئی روڈ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

Address:

Editor, Urdu quarterly
" Adabi Nasheman",
544-C/168 Almas Bagh, Hardoi
Road ,Lucknow-226003(U.P)

پروپرائیٹر، پبلیشر اور پرنٹر:

احمد رشیق نے نعمانی پرنٹنگ پریس، بارود خانہ، گولہ گنج، لکھنؤ سے طبع کرا کے ۵۴۴-سی/۱۶۸/الماس باغ، ہردوئی روڈ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳ سے شائع کیا۔

عناوین

اداریہ		۲
انور جلالپوری شخص سے شخصیت	ڈاکٹر عباس رضا نیر	۳
فقیر ہی تھا مگر شاندار میں بھی تھا	سہیل انجم	۷
گنگا جمنی تہذیب کی طرح پاکیزہ	ڈاکٹر اختر ریاض	۱۳
اردو شاعری میں گیتا	سنجے مصر اشوق	۱۶
انور جلالپوری کی شاعری	ڈاکٹر بشریٰ بانو	۱۹
وادی فکر و فن	ڈاکٹر محمد ثاقب	۲۱
اردو ادب کا شہسوار	مظفر اللہ خاں	۲۴
مسیح جملوں کے فنکار	احتشام افسر	۲۶
سماج کا سبق پڑھانے والا	محمد غفران نسیم	۲۸
میں جا رہا ہوں	عظمت علی	۳۱
ادب کی مجسم تصویر	سلمان عبد الصمد	۳۳
آسمان ادب کا ایک ستارہ	مختار معصوم املوی	۳۷
میری نظامت (انٹرویو)	قاضی عبد الرحمٰن	۳۹
منظوم ترجمہ/غزلیں	انور جلالپوری	۴۱-۴۷
مقدمہ نویسی	ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری	۴۹
افسانے		
جرمن شیفرڈ	ڈاکٹر مجاہد الاسلام	۵۴
اچھے دن	ڈاکٹر ڈاکٹر سلیم احمد	۵۹
غزلیں/منظوم خراج عقیدت		
میدان کارزار میں	رازؔ اعظمی	۹
حضرت انورؔ فقط	مخمور کاکوروی	۳۲
شعور فکر کا اک آسمان	انیسؔ مبارکپوری	۳۶
تبصرے		
باب دکن	ڈاکٹر وسیم افتخار	۶۱
آہٹ پانچویں موسم کی	ابراہیم افسر	۶۲
آپ کے خطوط		۶۴

نظریہ

اترپردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملے ۲۹ برس کا عرصہ گزر چکا ہے مگر آج تک یہ زبان نافذ ہونے سے محروم رہی حالانکہ اس دوران سازگار حکومتیں بھی آئیں مگر تب ''ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے''، اب تو حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں جس کی اصل وجہ حکومت کی تنگ نظری اور فرقہ پرست ذہنیت ہے۔ صرف اور صرف یہ ہے کہ اس زبان کو ایک خاص طبقہ یعنی اقلیتوں سے جوڑ کر مذہب کا لبادہ پہنا دیا گیا ہے، تقسیم ہند کے بعد سے ہی یہ زبان تعصب کی بنا پر اپنی ہی جائے پیدائش میں فرقہ پرستانہ، تنگ نظری اجنبیت اور سرد لہری کا شکار ہوگئی اور تبھی سے یہ اپنی بقا اور ترویج و ترقی کے لیے جدوجہد کر رہی ہے۔ اس کے دائرے کو محدود سے محدود تر کرنے کی منظم سازش کے تحت فرقہ پرست اور تنگ نظر تنظیموں کے ذریعہ منصوبہ بند طریقے سے کام کیا جارہا ہے۔ اردو زبان میں ملازمت کے دروازے بند کرنے کے راستے ہموار کیے جارہے ہیں اور ہم ہیں کہ اب بھی سوئے ہوئے ہیں۔

باقاعدہ طور پر اردو والوں کی حوصلہ افزائی کے دروازے بند کر کے حوصلہ شکنی کے دروازے کھولے جارہے ہیں۔ ۱۹۹۵ میں ملائم سنگھ یادو نے اپنے دور اقتدار میں اردو مترجمین / جونیئر کلرک کی تقرری کر کے اس زبان کو روزی روٹی سے جوڑنے کا راستہ ہموار کیا ۲۲ برس بعد آئی. جی. آر. ایس. کے تحت ایک شخص نے حکومت اتر پردیش سے یہ جاننا چاہا ہے کہ اردو مترجمین سے موجودہ وقت میں کس طرح کا کام لیا جا رہا ہے، گزشتہ ۱۲۔۱۵ برسوں میں اردو مترجمین کے ذریعہ اردو میں کسی کام کا نہ کیا جانا، دفاتر میں اردو سے متعلق کام اور مستقبل میں کیا اس کی کوئی ضرورت ہے؟ اب ان سوالوں کے جواب کے لیے حکومت اتر پردیش نے تمام دفاتر کے سربراہوں سے جواب طلب کیا ہے۔ ۱۹۹۵ سے آج تک کئی سرکاریں آئیں اور چلی گئیں اس دوران اس طرح کا کوئی متعصّبانہ سوال نہیں کیا گیا مگر آج ۲۲ برس سے کام کر رہے اردو مترجمین آنکھوں میں کانٹوں کی طرح چبھنے لگے۔ ظاہری بات ہے حکومت میں بیٹھے تنگ ذہن افسران کو اردو سے کیا لینا دینا وہ کب اردو کا بھلا چاہیں گے۔ یقیناً اردو مترجمین یا اردو کے دیگر عہدوں پر تقرری کے لیے راستہ بند کرنے کی یہ منصوبہ بند سازش ہے جب کہ تلنگانہ میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے اور وہاں کے کشادہ ذہن وزیر اعلیٰ نے سرکاری دفاتر میں ۶۶ اردو مترجمین جسے اردو آفیسر کا نام دیا جائے گا تقرری کے عمل کو سختی سے یقینی بنانے جارہی ہے۔ اپنی زبان کی حفاظت کرنا ہمارا اولین فرض ہی نہیں جہاد بھی ہے کیوں کہ جو قوم اپنی زبان سے محروم ہوجاتی ہے اس قوم کا وجود ختم ہونے میں دیر نہیں لگتی۔

وقتاً فوقتاً اردو کی ترویج و ترقی یا اردو کے تحفظ و بقا کے نام پر مختلف انجمنیں قایم ہوئیں مگر خلوص کا فقدان اور استقامت کی کمی کی وجہ سے یہ انجمنیں دم توڑتی گئیں فی الحال ایسی کوئی سنجیدہ انجمن یا تحریک نہیں ہے جو مختلف شعبوں میں کام کر رہے تمام محبان اردو کو ایک پلیٹ فارم پر کھڑا کر اردو کو اس کا جائز حق دلانے کی کوشش کرتی۔ آج وقت کی شدید ضرورت ہے متحرک انجمن یا تحریک کی۔ گاؤں گاؤں اور محلے محلے انجمن بنا کر اس تحریک کو آگے بڑھایا جائے۔

واٹس ایپ گروپ ادبی نشیمن کے نام سے قارئین کے مطالعہ اور پوسٹ کے لیے شروع کر دیا گیا ہے۔ ایڈیٹر

سال ۲۰۱۸ کی آمد پر ابھی مبارک باد کا سلسلہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ بھگوت گیتا، گیتا نجلی اور خیام کی رباعیات کے منظوم ترجمہ نگار انور جلالپوری ۷۱ برس کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ انور جلال پوری کی اصل شناخت ایک کامیاب ناظم کے طور پر ہوتی ہے ۱۹/جنوری کو ممتاز جدید شاعر ساقی فاروقی کا لندن میں اور ۲۰ جنوری کو معروف افسانہ نگار، خاکہ نگار اور ڈرامہ نگار قدیر زماں بھی حیدرآباد دکن میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے جب کہ جدید نظم اور جدید غزل کو بلندیوں تک پہنچانے والے محمد علوی کا ۲۹/جنوری کو احمد آباد میں انتقال ہوگیا۔ یقیناً یہ اردو ادب کے لیے ایک بڑا سانحہ ہے۔

ادبی نشیمن کے پہلے شمارے کی بیحد پذیرائی کے بعد دوسرا شمارہ انور جلالپوری کی شخصیت اور ادبی خدمات پر مرکوز ہے۔ جنہیں انتقال کے بعد مرکزی حکومت کی جانب سے پدم شری ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا۔ غالباً ان کے علمی و ادبی کارناموں پر خراج عقیدت پیش کرنے کی یہ پہلی باقاعدہ کوشش ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں قارئین کے تاثرات کا انتظار رہے گا۔

ڈاکٹر سلیم احمد

انور جلال پوری

شخص سے شخصیت تک



ڈاکٹر عباس رضا نیّر
صدر شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ
موبائل نمبر 9919785172

عظیم اودھ کا قدیم دارالسلطنت لکھنؤ سے پہلے فیض آباد تھا۔ فیض آباد بھی گنگا جمنی تہذیبی وراثتوں کا عجیب وغریب مسکن ہے۔ شری رام چندر جی کا جنم استھل بھی یہیں ہے اور حضرت آدم کے بیٹے شیث پیغمبر کی قبر بھی یہیں ہے۔ اسی فیض آباد سے شہید احمد شاہ نے لکھنؤ آکر بیگم حضرت محل کی قیادت میں انگریزوں سے جنگ لڑی اور اسی فیض آباد جیل میں شہید وطن اشفاق اللہ خان کو پھانسی دی گئی۔ یہ فیض آباد میر ببر علی انیس کا بھی شہر ہے اور برج نرائن چکبست کا بھی۔ اس فیض آباد سے شیخ امام بخش ناسخ کا بھی تعلق رہا ہے اور خواجہ حیدر علی آتش کا بھی۔

ضلع امبیڈکر نگر کے قیام سے پہلے قصبہ جلال پور بھی ضلع فیض آباد میں ہی آتا تھا۔ غیر منقسم فیض آباد ضلع کا یہ قصبہ بھی بھائی چارے اور امن وآشتی کی منھ بولتی مثال ہے۔ جہاں ایک ہی ہینڈ پائپ سے مولانا صاحب اپنے لوٹے اور پنڈت جی اپنی لوٹیا میں پانی بھرتے ہیں۔ اس چھوٹی سی بستی نے بھی اردو زبان وادب کو بڑی بڑی ہستیاں عطا کی ہیں۔ اسی قصبے کے ایک علمی گھرانے یعنی محترم حافظ محمد ہارون کے آنگن میں ۶ رجولائی ۱۹۴۷ء کو ایک چراغ روشن ہوا۔ جس کے والدین نے اس کا نام انوار احمد رکھا۔ یہ شخص جیسے جیسے علم وادب کے پروبال نکال کر شخصیت کی طرف بڑھنے لگا اس کے خدوخال کی کشش دنیا کو اپنی جانب متوجہ ہی نہیں بلکہ متاثر بھی کرنے لگی، میانہ قد، **موزوں بدن، ستواں ناک، متبسم ہونٹ، نرگسی آنکھیں، سنجیدہ پیشانی، گھنگرالے بال، روشن آواز اور کھنک دار لہجے والا یہ شخص جب بولتا تھا تو زمانے رک جاتے تھے۔ بلکہ زمانہ ہی بدل جاتا تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا کہ وہ تھا ہی ایسا خوش نصیب جس نے اپنی ولادت کے بیسویں دن ہی ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزادی دلادی۔ اور دیکھتے دیکھتے آزاد ہندوستان اسے انور جلال پوری کے نام سے** پہچاننے لگا۔

انور جلال پوری کے والد حافظ محمد ہارون صاحب ایک مذہبی انسان تھے ان کا دل وسیع اور دماغ کشادہ تھا۔ وہ جلال پور کے قدیم مدرسے ندائے حق کے سرپرست بھی تھے اور منیجر تھی۔ وہ حافظ قرآن تو تھے ہی عربی میں متنبّی، فارسی میں مولانا روم اور اردو میں انیس واقبال کے اشعار بھی انہیں ازبر تھے۔ آئے دن ان کے گھر شعری نشستوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ انور جلال پوری نے آنکھ کھولتے ہی جہاں ملک کی آزادی دیکھی وہیں تقسیم اور ہجرت کے المیے سے بھی دوچار ہوئے۔ ابھی وہ درجہ سات آٹھ میں طالب علم تھے کہ غزلیں کہنے لگے۔ ان کے گھرانے سے بھی کئی بزرگ پاکستان چلے گئے اور خاص طور سے میرے نانیہال سے منتظم نانا اور فضہ نانی جیسی اہم شخصیات جلال پور چھوڑ کر کراچی جا بسے۔ منتظم نانا تو خیر انور صاحب کے دوستوں میں تھے۔ انہیں وہ کبھی بولتے نہیں تھے۔ منتظم نانا کراچی چھوڑ

کر دبئی میں بینک منیجر ہو گئے تھے۔ پہلی بار انہیں کے کسی مشاعرے میں انور صاحب دبئی شریک ہوئے تھے جس کا ذکر وہ اکثر کیا کرتے تھے۔ انور جلال پوری کی ابتدائی زندگی میں ہجرت کا یہ احساس نہایت شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ ایسے اشعار میں جذبوں کا وفور بھی بے تحاشہ پایا جاتا ہے۔ مثلاً:

نہ بام و در نہ کوئی سائبان چھوڑ گئے
مرے بزرگ کھلا آسمان چھوڑ گئے
وہ جس کو پڑھتا نہیں کوئی بولتے سب ہیں
جناب میر بھی کیسی زبان چھوڑ گئے
ہمیں گلہ بھی ہے انور تو صرف ان سے ہے
جو لوگ خوف سے ہندوستان چھوڑ گئے

مکتب کی تعلیم کے بعد انور جلال پوری صاحب نے جلال پور میں ہی نریندر دیو انٹر کالج اور پھر اعظم گڈھ میں شبلی کالج پھر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم۔ اے کیا۔ اردو میں ایم۔ اے انہوں نے اودھ یونیورسٹی فیض آباد سے کیا لیکن انور جلال پوری کی شخصیت رسمی ڈگریوں سے بہت بلند ہے۔ چنانچہ آج ان کے اوپر کئی یونیورسٹیوں میں پی ایچ. ڈی کے مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ انور جلال پوری کا مطالعہ بھی بہت تھا اور مشاہدہ بھی۔ ان کی غزلوں کے چار مجموعے شائع ہوئے۔ ''کھارے پانیوں کا سلسلہ، خوشبو کی رشتے داری، ادب کے اکشر، اور بہار کی سوغات۔'' حمدیہ اور نعتیہ شاعری کے مجموعے ہیں۔ ''ضرب لا الٰہ، بعد از خدا، حرف ابجد اور جمالِ محمدؐ'' انور صاحب جتنی اچھی شاعری کرتے تھے اتنی ہی اچھی نثر بھی لکھتے تھے۔ ان کے نثری مضامین تقریباً سو کی تعداد کو پہنچتے ہیں۔ اب تک ان کے مضامین کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ روشنائی کے سفیر، اپنی دھرتی اپنے لوگ، قلم کا سفر اور مضمران ادب۔ خود انور صاحب کی شخصیت اور فن پر لوگوں نے بہت سے مضامین لکھے۔ جن میں دو کتابیں تو بنیادی مآخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک کتاب ہے ''انور جلال پوری: شخصیات اور جہات'' جسے ۲۰۰۹ء میں اسلم الہ آبادی نے تصنیف کیا اور دوسرا مجموعۂ مضامین ہے ''انور جلال پوری: ادب کے آئینے میں'' جسے خود ان کے ہونہار فرزند ڈاکٹر جاں نثار عالم نے ۲۰۱۵ء میں مرتب کیا۔ ادھر آ کے انور جلال پوری کے منظوم تراجم ان کی شناخت کا بنیادی حوالہ بن گئے تھے۔ انہوں نے قرآن کریم کے تیسویں پارے کا منظوم مفہومی ترجمہ کیا تو دوسرے طرف شریمد بھگوت گیتا کے اٹھاروں ابواب کا بھی ترجمہ اردو شاعری میں کیا۔ قومی شاعر رویندر ناتھ ٹیگور کی گیتا نجلی کا بھی منظوم ترجمہ کیا اور رباعیاتِ خیام کا بھی، ان کامیاب ترجموں میں انہیں ملٹی لنگول شخصیت کا مالک بنا دیا تھا۔ اردو انور جلال پوری کی مادر زبان تھی، ہندی ان کی قومی زبان تھی، انگریزی کے وہ لیکچرر تھے، عربی سے انہوں نے تیسویں پارے کا منظور ترجمہ کیا تھا، سنسکرت سے شریمد بھگوت گیتا فارسی سے رباعیات خیام کا اور بنگلہ سے رویندر ناتھ ٹیگور کی گیتا نجلی کا۔ اس اعتبار سے انور جلال پوری کا تعلق ساری زبانوں سے براہ راست تھا۔ گویا انہیں اپنے عہد کے ہفت خواں کی حیثیت حاصل تھی۔ ''اردو شاعری میں گیتا'' کے بعد انور جلال پوری کا اگلا منصوبہ تھا ''مہاتما بدھ'' کی منظوم سوانح لکھنے کا تھا جو ان کے انتقال کے سبب مکمل نہ ہو سکا۔ گیتا کے اٹھارہ ابواب میں ۹۶۲ شلوک ہیں۔ جن میں سے ۷۰۱ شلوکوں کا منظوم ترجمہ انور صاحب نے ۷۶۱ اشعروں میں کیا ہے۔ اردو میں اب تک گیتا کے ۸۲ ترجمے ہو چکے ہیں۔ ایک درجن سے زیادہ منظوم ترجمے ہیں لیکن ہمارے عہد کے تقاضوں کے پیش نظر انور صاحب کا منظوم ترجمہ سب سے زیادہ سلیس اور رواں رواں ہے۔ انور صاحب کے بقول اس منظوم ترجمے کے وقت انور صاحب کے سامنے گیتا کے ۱۴/ اردو ترجمے تھے۔

۲۰۱۶ء میں سرفراز عالم نے خود انور جلال پوری کے غزلوں کے منتخب اشعار کا انگریزی ترجمہ ''Rays of thought'' کے نام سے شائع کیا۔ انور صاحب کا ماننا تھا کہ آسمانی علوم ہوں یا ادب

عالیہ انہیں کسی مذہب یا کسی زبان میں محدود نہیں کیا جاسکتا۔ انور جلال پوری کی ایک صفت یہ بھی تھی کہ وہ جہاں بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے وہیں اپنے وطن میں بھی ہر دل عزیز تھے۔ چنانچہ وہ جس روانی سے اردو، ہندی اور انگریزی بولتے تھے اسی روانی کے ساتھ وہ اودھی بھی بولتے تھے جسے میں جلال پوری کی کچی اردو کہا کرتا ہوں۔ میرے نانا حکیم انصار حسین کیف جلال پوری اور میرے دادا جناب رفیق حسین کربلائی سے انور صاحب کے والد محترم حافظ محمد ہارون صاحب سے گھریلو مراسم تھے۔ میرے والد جناب عزادار حسین خود انور جلال پوری کے کلاس فیلو رہے۔ میری بڑی بہن خورشید نگار صاحبہ انور صاحب کی بیٹی نزہت مثال کی کلاس فیلو رہیں۔

انور صاحب کے بیٹے شاہکار عالم میرے دوست ہیں۔ ان کے بڑے بیٹے شہریار عالم شہریار جلال پوری اور چھوٹے بیٹے ڈاکٹر جاں نثار عالم بھی ہم سب کو بہت عزیز رکھتے ہیں اور ہم بھی انہیں اسی طرح عزیز رکھتے ہیں۔

انور جلال پوری کی لیاقتوں کے پیش نظر انہیں حکومت اتر پردیش نے جہاں خواجہ معین الدین چشتی عربی، فارسی اردو یونیورسٹی کی ایکزیکیٹیو کمیٹی کا ممبر اور اتر پردیش اردو اکادمی کا رکن بنایا وہیں اتر پردیش مدرسہ بورڈ کا چیئرمین بنا کر وزیر مملکت کا درجہ بھی دیا۔ انور صاحب نے مدرسہ بورڈ کے نصاب کو ماڈرن کرنے میں پہلا قدم یوں اٹھایا کہ اس نصاب میں انگریزی کے ساتھ میتھس اور سائنس کے مضامین بھی شامل کیے تاکہ دینی درسگاہوں کے بچے بھی دنیا کو کھلی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔

انور جلال پوری صاحب کی علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں امتیاز میر، فراق سمان، نظیر اوارڈ، ماٹی رتن اور شہنشاہ نظامت اوارڈ ہی نہیں بلکہ حکومت اتر پردیش کا سب سے بڑا اوارڈ یش بھارتی سمان بھی پیش کیا گیا۔ مرکزی حکومت نے انور صاحب کے انتقال کے بعد انہیں پدم شری اعزاز دینے کا اعلان کیا۔ حالانکہ یہ اعزاز تو انہیں بہت پہلے ان کی زندگی میں ہی مل جانا چاہئے تھا۔ لیکن وہ کسی ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کے بغیر اردو زبان وادب کی بے لوث خدمت کرنے والوں میں تھے۔ پس از مرگ پدم شری اوارڈ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس اعزاد کی حصولیابی میں کسی طرح کی جوڑ توڑ نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ حکومت نے خود انور جلال پوری کی لیاقتوں کا اعتراف کیا ہے۔

خود اپنے قصبے میں تعلیم وتدریس کو فروغ دینے کے لیے انہوں نے مرزا غالب اسکول کی بنیاد رکھی جو آج انٹر کالج ہو چکا ہے۔ انور صاحب، مولانا آزاد ایجوکیشنل سوسائٹی کے صدر بھی رہے اور مرزا غالب انٹر کالج کے بانی بھی۔ اس مرزا غالب انٹر کالج کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ یہاں سے ہر سال ایک بڑی تعداد میں غیر مسلم طلبا وطالبات اردو کی تعلیم حاصل کر کے فارغ ہوتے ہیں۔ جلال پور میں بھائی چارے اور امن وآشتی کا ماحول بنائے رکھنے میں انور جلال پوری صاحب نے ہمیشہ بنیادی کردار ادا کیا۔ کہیں کوئی بھی ناخوش گوار واقعہ ہوتا تو انور صاحب فوراً ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، شیعہ، سنی، کاروباری، مفکر، ادیب، عالم ہر طبقے سے لوگوں کو اکٹھا کر لیتے تھے اور امن مارچ نکال کر قصبے میں محبت کی فضا قائم کر دیتے تھے۔ انور جلال پوری کے نام سے جلال پور میں ایک تعلیمی ادارے کا قیام ہی ان کو سچا خراج عقیدت ہوگا۔

انور جلال پوری صاحب کی بیٹی نزہت مثال لندن میں رہتی تھیں۔ ابھی پچھلے دنوں ان کا انتقال ہو گیا جس کے صدمے کو انور صاحب پوری طرح کھل کر ظاہر نہیں کر پا رہے تھے۔ چونکہ انہیں بیوی، بچے، بہو، پوتے، پوتیاں اور نواسوں کو بھی سنبھالنا تھا۔ نزہت آپا کی تعزیت کے لیے میں اپنی بہن خورشید نگار اور بھائی کاشف رضا عرشی کے ساتھ ان کے یہاں گیا تو پورے گھر کے ساتھ ہم لوگ دیر رات بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ سب نے ایک ساتھ کھانا کھایا۔ وہ اس دن بھی ادھر ادھر کی باتیں کر کے اپنے دل کو ضرور بہلانے کی

کوششیں کررہے تھے لیکن لگ رہا تھا کہ اب وہ اندر سے بالکل ٹوٹ چکے ہیں۔ جلال پور میں ۲۶ر دسمبر ۲۰۱۷ء کو ان کی بیٹی کا چالیسواں تھا پورا قصبہ شریک ہوا۔ ۲۸ر دسمبر کو واپس لکھنؤ آئے۔ ۲۸ر کی شام کو ہی انہیں برین اسٹروک ہوا، فوراً ایک قریبی ہسپتال اور پھر ٹراما سنٹر کنگ جارج میڈیکل یونیورسٹی میں لایا گیا جہاں پانچ راتیں انور صاحب نے وینٹیلیٹر پر گزاریں اور ۲ر جنوری ۲۰۱۸ء کو صبح دس بجے آخری سانس لی۔ پہلی جنوری کو ہم نے شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ میں نہال رضوی صاحب کی غزلوں کے دو مجموعوں کا اجرا رکھا تھا جس میں اظہار خیال کے لیے انور صاحب کو فون کیا تھا تو وہ یہ کہہ کے خوش ہوئے تھے کہ اس نئی روایت کے بھی بانی تمہیں ہو کہ ایک نئے سال کا آغاز دو دو کتابوں کے اجرا سے کررہے ہو۔ انشاء اللہ میں ضرور آؤں گا۔ لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ جس کی ولادت ملک کو آزادی کا تحفہ دے گئی تھی اس کا انتقال ہم سے ۲۰۱۸ء عیسوی کے نئے سال کی خوشیوں کو اس طرح غم میں بدل دے گا۔ انور جلال پوری صاحب کے انتقال کی خبر لکھنؤ ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ لکھنؤ کے ہندی، اردو، انگریزی کے تمام ادیب اور شاعر ٹراما سنٹر اور پھر ان کی رہائش گاہ ڈھینگرا اپارٹمنٹ حسین گنج پہنچ گئے۔ ۳ر جنوری ۲۰۱۸ء کو جلال پور میں ان کی تدفین ہوگئی۔ جس میں بلاتفریق مذہب وملت ایک کثیر مجمع نے شرکت کی اور نم آنکھوں سے انہیں خراج محبت پیش کیا۔

انور صاحب امن، آشتی اور صلح کل کے قائل تھے۔ ان کی شاعری ان کی زندگی کی سچی آئینہ دار تھی۔ وہ اپنے ہر شعر کے ذریعہ کوئی نہ کوئی پیغام دیتے تھے۔ حیات اور کائنات کے ہر اہم موڑ کو وہ اپنی شاعری کا موضوع بناتے تھے۔ ہم ان کی زندگی کو دیکھتے تو ہمیں ان کا یہ شعر یاد آتا:

ہم کاشی کعبہ کے راہی ہم کیا جانیں جھگڑا بابا
اپنے دل میں سب کی الفت اپنا سب سے رشتہ بابا

انور صاحب کے عہد پر ہماری نظر جاتی تو ان کا یہ شعر یاد آتا:

دلوں میں زخم لبوں پر ہنسی زیادہ ہے
ہمارے دور میں بے چہرگی زیادہ ہے

وینٹیلیٹر پر ان کی عیادت کو گئے تو ان کے ہی شعر نے ہماری ڈھارس بندھائی:

ابھی آنکھوں کی شمعیں جل رہی ہیں پیار زندہ ہے
ابھی مایوس مت ہونا ابھی بیمار زندہ ہے

ہم نے ان کا آخری دیدار کیا تو ان کا ہی شعر ہمارے سامنے آیا:

مری بستی کے لوگو! اب نہ روکو راستہ میرا
میں سب کچھ چھوڑ کر جاتا ہوں دیکھو حوصلہ میرا

ہم نے ان کے جنازے کو کاندھا دیا تو ہمیں انہیں کے شعر نے رلایا:

میں جارہا ہوں مرا انتظار مت کرنا
مرے لیے کبھی دل سوگوار مت کرنا

انور جلال پوری کے انتقال سے کسی ایک زبان یا کسی ایک مذہب یا کسی ایک طبقے کا نقصان ہی نہیں ہوا بلکہ مجموعی طور سے عالم انسانیت کا نقصان ہوا چونکہ وہ ایک شاعر، ادیب اور دانشور ہی نہیں بلکہ دردمند انسان بھی تھے۔ سب کے درد کو اپنا درد سمجھتے تھے۔ آج انور جلال پوری صاحب ابدی نیند سو چکے ہیں اور دنیا بھر کے لوگ ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں کہ انور جلال پوری صاحب شیعہ تھے یا سنی، ہندو تھے یا مسلمان اور یہ سوال ہی ان کی شخصیت کا ہر دل عزیزی اور ان کے کردار کی عظمت کا زندہ ثبوت ہے۔



فقیر ہی تھا مگر شاندار میں بھی تھا

انور جلالپوری

سہیل انجم
370/6 ذاکر نگر، نئی دہلی
موبائل نمبر 09818195929

۲؍جنوری کو صبح کے وقت جب سوشل میڈیا پر انور جلال پوری کے انتقال کی خبر آئی تو پوری اردو دنیا سکتے میں آ گئی۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے دیگر ملکوں میں بھی اسے ایک روح فرسا خبر قرار دیا گیا اور ان کے انتقال کو ادب کا ایک عظیم خسارہ تصور کیا گیا۔ ان کی عمر کم تھی نہ بہت زیادہ تھی۔ وہ 71 برس کے تھے۔ اس زمانے میں اگر کوئی اتنی عمر جی لے تو بہت ہے۔ لیکن ان کے انتقال سے شعری و ادبی حلقوں میں ایسا ہنگامہ برپا ہوا کہ جیسے کوئی انہونی ہو گئی ہو۔ دراصل اس کی وجہ ان کا اچانک انتقال کر جانا ہے۔

ابھی 24 دسمبر کو انھوں نے ایک مشاعرے کی نظامت کی تھی۔ وہ ان کی آخری نظامت ثابت ہوئی۔ وہ بیمار تو نہیں تھے، البتہ دل کے مریض ضرور تھے۔ ان کی اوپن ہارٹ سرجری ہوئی تھی۔ لیکن تھے تندرست اور چاق و چوبند۔ البتہ 17 نومبر کو لندن میں ان کی اکلوتی بیٹی کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہاں سے واپسی کے بعد سے ہی وہ شدید ذہنی خلفشار اور تناؤ کے شکار تھے۔ 28 دسمبر کو جلال پور میں اپنے کسی شناسا کی تدفین میں شرکت کے بعد لکھنؤ واپس آئے تھے اور غسل خانے میں تھے کہ ان پر برین ہیمریج کا حملہ ہوا۔ وہ گر پڑے اور بیہوش ہو گئے۔ کافی دیر تک وہ باہر نہیں آئے۔ گھر والوں نے جا کر دیکھا تو انھیں بیہوش پایا۔ ان کے سر میں شدید چوٹ آئی تھی۔ انھیں اسپتال میں داخل کیا گیا۔ چار روز تک وہ وینٹی لیٹر پر رہے۔ ڈاکٹروں نے ان کے دماغ کے آپریشن کا فیصلہ کیا مگر موت نے اس کی مہلت نہیں دی۔ بیہوشی ہی کے عالم میں وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

یوں تو انور جلال پوری کی شہرت ایک ناظم مشاعرہ کی حیثیت سے زیادہ تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ مشاعروں کی نظامت ان کی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں میں سے ایک پہلو تھا۔ وہ کثیر جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک شاعر تھے، ایک ناظم تھے، ایک نثر نگار تھے، ایک مترجم تھے اور ایک بہت اچھے انسان تھے۔ وہ انگریزی ادبیات کے استاد بھی تھے۔ انھوں نے گیتا کا اردو میں جو منظوم ترجمہ کیا ہے اس نے انھیں ایک الگ شناخت عطا کی۔ وہ ایک انتہائی سیکولر انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں یکساں مقبول تھے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ وہ دونوں فرقوں کے تعلیم یافتہ طبقات کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتے تھے۔

لیکن بہر حال نظامت کا ان کا فن ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ بہت سے لوگ انھیں صرف ایک ناظم مشاعرہ کی حیثیت سے ہی جانتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے فن نظامت کو ایک نئی بلندی عطا کی۔ عالمی شہرت یافتہ ناظم اور شاعر ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کے بعد مشاعروں میں نظامت کی جو ایک خاص روایت شروع ہوئی تھی انھوں نے اس کو توسیع دینے اور آگے بڑھانے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ ان کی نظامت کی خاص بات یہ تھی کہ عوامی مشاعرے ہوں یا خواص کے مشاعرے، وہ ہر قسم کے مشاعروں کی نظامت کا فن جانتے تھے۔ ان کی نزاکتوں سے واقف تھے۔ حالانکہ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ جو ناظم خواص کے مشاعروں کی نظامت کامیابی سے کر رہا ہو وہ عوامی مشاعروں کی نظامت بھی اسی

کامیابی سے کرلے۔اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ عوامی مشاعروں کا کامیاب ناظم خواص کے مشاعروں کو بھی بخیر و خوبی انجام تک پہنچا دے۔ میں اس سلسلے میں ملک کے معروف شاعر اور ناظم عمر قریشی کی مثال دینا چاہوں گا۔ وہ عوامی یا متوسط درجے کے مشاعروں کے بہت اچھے ناظم تھے۔ سامعین اور شعرا دونوں کی نبض پہچانتے تھے اور انھیں مجمع کو مٹھی میں کرنا خوب آتا تھا۔لیکن خواص کے یا اعلیٰ پائے کے مشاعروں میں وہ اکثر ناکام ہو جاتے تھے۔ انھیں لال قلعہ کے مشاعرے کی نظامت کرنے کے لیے بھی مدعو کیا گیا تھا مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ حالانکہ وہ اس فن کے استاد تھے۔عوام اور خواص دونوں قسم کے مشاعروں کو کامیابی کے ساتھ کنڈکٹ کرنا اور مجمع کو اپنی مٹھی میں لے کر مشاعرہ چلانا ایک الگ فن ہے۔ انور جلال پوری اس فن سے نہ صرف واقف تھے، بلکہ وہ اس کے ماہر بھی تھے۔ وہ عوامی یا دوسرے، تیسرے درجے کے مشاعرے ہوں یا اعلیٰ سطحی مشاعرے، ہر قسم کے مشاعرے کو کامیابی کے ساتھ ان کی منزل تک پہنچانے کا ہنر جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں عوام میں بے انتہا مقبول تھے وہیں خواص میں بھی انھیں مقبولیت حاصل تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ نظامت کے معاملے میں ان کے یہاں روایت اور جدت کا سنگم تھا۔ایسے ناظم اب ڈھونڈے سے بھی نہیں ملیں گے۔ میں ان کی نظامت سے سب سے پہلے 70 کی دہائی میں واقف ہوا تھا۔ اس وقت ثقلین حیدر اور ملک زادہ منظور احمد کا طوطی بولتا تھا۔لیکن اسی درمیان سے انور جلال پوری نے اپنے لیے راہ نکالی اور اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی۔ نظامت کا ان کا انداز دوسروں سے جداگانہ تھا۔ میں جب بھی ان سے گفتگو کرتا تو ایسا لگتا کہ میں ان کی باتیں نہیں سن رہا ہوں بلکہ ان کی نظامت سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ انھوں نے خود کو فن نظامت کے دریا میں اس قدر غرق کر دیا تھا کہ وہی ان کا انداز گفتگو بھی بن گیا تھا۔

انور جلال پوری کے اندر نظامت کے جراثیم ابتدائے عمر سے ہی موجود تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب ''روشنائی کے سفیر'' میں اپنے بارے میں ایک مضمون لکھا ہے جس کا عنوان ہے ''میں خود کو باندھنے میں کئی بار کھل گیا''۔ وہ جلال پور ضلع امبیڈکر نگر اتر پردیش میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ 8 مئی 1946 ان کی تاریخ پیدائش ہے۔ حالانکہ تعلیمی ریکارڈ میں یہ 6 جولائی 1947 ہے۔1960 میں جب وہ نریندر دیو انٹر کالج جلال پور میں نویں درجے میں تھے اسی وقت سے انھوں نے شاعری شروع کر دی تھی۔ کالج میں تقریری مقابلوں میں حصہ لیتے تھے۔ انھیں 1962 میں ایک ادبی نشست کی نظامت کا بھی شرف حاصل ہوا تھا۔یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی نظامت کی بنیاد 1962 ہی میں پڑ گئی تھی۔ لیکن نظامت کی مصروفیت یا نظامت کی مرہون منت شہرت نے ان کے شعری سفر کی رفتار سست کر دی تھی۔

وہ لکھتے ہیں ''مشاعروں کی نظامت نے مجھے بڑی عزت دی۔ دبئی، شارجہ، ابوظہبی، العین، مسقط، قطر اور بحرین کے مشاعروں کے علاوہ پاکستان اور سعودی عرب کے مشاعروں میں بھی بارہا نظامت کرنے کا شرف حاصل ہوا.....امریکہ جہاں وضو ٹوٹ جانے کا ہمیشہ خطرہ رہتا ہے، وہاں بھی 2001 اور 2004 میں جانے کا اتفاق ہوا۔ امریکہ کے ڈیڑھ درجن شہروں کے مشاعروں کی نظامت کا موقع ملا۔ .....نظامت کی وجہ سے میری شاعری کو نقصان پہنچا۔ میری شخصیت یک رخی ہو گئی''۔ انھوں نے اپنے تقریباً پچاس سالہ دور نظامت میں جن اہم شعرا کا تعارف کرایا ان میں فراق گورکھپوری، علی سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، کیفی اعظمی، کنور مہیندر سنگھ بیدی سحر، جگن ناتھ آزاد، کیفی بھوپالی، نشور واحدی، فنا نظامی کانپوری، خمار بارہ بنکوی، کامل شفیقی، شمسی مینائی، انور صابری، والی آسی، کرشن بہاری نور، ناظر خیامی، ساغر خیامی اور ساغر اعظمی جیسے اعلیٰ پائے کے شعرا اور دنیائے شعر و ادب کے آفتاب و ماہتاب شامل ہیں۔

لیکن مشاعروں کا معیار جس طرح سے گر گیا ہے اس سے وہ بھی بہت فکرمند رہا کرتے تھے۔ حقیقی شاعروں کی جگہ پر متشاعروں کو سننا اور معیاری کلام کے بجائے گلے بازی کو داد دینا اب عام ہو گیا ہے۔ نام

نہاد شاعرات کی شرکت نے بھی مشاعروں کے معیار کو گرایا ہے۔ ایسے مشاعروں میں ناظم حضرات بڑی کشمکش میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ چونکہ انھیں مشاعرے کو کامیابی کے ساتھ اختتام تک پہنچانا ہوتا ہے اس لیے وہ ایسے شعرا کی بھی قصیدہ خوانی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جن کا نام لینا بھی انھیں گوارہ نہ ہو۔ ایک بار انھوں نے راقم کو فون کر کے بتایا کہ وہ لال قلعہ کے مشاعرے کی نظامت کرنے کے لیے دہلی آ رہے ہیں۔ انھوں نے مجھے حکم دیا کہ تم بھی اس میں آنا۔ اور کہنے لگے کہ ''دیکھنا میں رات بھر کیسے جھوٹ بولتا ہوں''۔ یہ جملہ ادا کر کے وہ ہنسنے لگے لیکن ان کی ہنسی بڑی کھوکھلی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بظاہر ہنس رہے ہیں لیکن بہ باطن مشاعروں کے گرتے ہوئے معیار پر طنز کر رہے ہیں۔

انور جلال پوری کے یوں تو متعدد شعری کارنامے ہیں لیکن گیتا کا منظوم ترجمہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ جہاں ایک مقدس علمی خزانے کو اردو میں منتقل کرنا ہے وہیں ایک مذہب کے پاکیزہ خیالات کو دوسرے مذہب کے پیروؤں تک پہنچانا بھی ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں اس قسم کے کاموں کی بڑی ضرورت ہے۔ تین سو صفحات پر مشتمل اس ترجمے میں جس کا نام ہے ''اردو شاعری میں گیتا'' انتہائی سادہ، سہل اور عام فہم زبان استعمال کی گئی ہے۔ ہندی کے بزرگ شاعر گوپال داس نیرج نے ابتدائیہ میں لکھا ہے کہ ''اگرچہ اس میں ایک ایک اشلوک کا ترجمہ چھ چھ مصرعوں میں کیا گیا ہے لیکن یہ اتنا سہل، عام فہم اور سلیس ہے کہ فوراً ازبر ہو جاتا ہے''۔ یہ کام آسان نہیں بہت مشکل تھا۔ لیکن انور صاحب نے اس مشکل کام کو بھی کر ڈالا اور اپنی کلاہ میں ایک اور باوقار کلغی کا اضافہ کر دیا۔ اس ترجمے کے سلسلے میں انور جلال پوری لکھتے ہیں: ''بھگوت گیتا کو سمجھنے اور اسے اردو کا لباس پہنانے میں مجھے بڑی ذہنی محنت اور تحقیقی صلاحیت خرچ کرنی پڑی۔ مجھے اشلوک کا ترجمہ ہندی، اردو اور انگریزی میں پڑھنا پڑا۔ پھر تشریح اور تفسیر سے واقفیت حاصل کرنی پڑی۔ پھر تشریح کو خلاصے میں محفوظ رکھنا پڑا اور بعد میں اس خلاصے کو شعری پیکر میں ڈھالنا پڑا۔ زبان سہل اور سادہ بنی رہے اس کا بھی دھیان ہر وقت رکھنا پڑا''۔

گیتا کے پہلے اشلوک کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

دھرت راشٹر آنکھوں سے محروم تھے
مگر یہ نہ سمجھو کہ معصوم تھے
انھیں بھی تھی خواہش کہ دنیا ہے کیا
اندھیرا ہے کیا اور اجالا ہے کیا
وہ اک شخص سنجے پڑا جس کا نام
وہی ان سے آخر ہوا ہم کلام
اسے رب نے ایسی نظر بخش دی
کہ بن دیکھے ہر ایک شے دیکھ لی
دھرت راشٹر راجہ بھی تھے باپ بھی
سمجھتے تھے وہ پنیہ بھی پاپ بھی
محبت سے بیٹوں کی سرشار تھے
عجب طرح کے وہ بھی کردار تھے
انھیں بھی تھی خواہش کہ سب جان لیں
سبھی لڑنے والوں کو پہچان لیں
کہانی تو سنجے سناتا رہا
ہے میدان میں کیا بتاتا رہا
وہ میداں جو تھا جنگ ہی کے لیے
وہیں سے جلے دھرم کے بھی دیے

انھوں نے رابندر ناتھ ٹیگور کی طویل بنگلہ نظم ''گیتا نجلی'' کا بھی منظوم ترجمہ کیا ہے۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں: ''ٹیگور کی گیتا نجلی کے ساتھ تو عجیب و غریب واقعہ ہے۔ یہ ابتدائی طور پر لکھی گئی بنگلہ زبان میں۔ بنگالی کلچر کا سارا نغمہ اور سنگیت اس میں جذب ہے۔ پھر اس کا ترجمہ انگریزی میں ہوا۔ بعد میں اردو میں ہوا۔ اب اردو کے نثری ترجمے کو شاعری بنانا ہے۔ آپ اندازہ لگائیے کہ اصل روح کو اس میں شامل کرنا کتنا مشکل ہے۔ پھر بھی یہ میرا دیوانہ پن ہے کہ میں نے ان

نظموں کو اردو شاعری میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ نظمیں مختلف بحروں میں ہیں مگر ہر بحر مترنم ہے۔ میری خواہش ہے کہ کتاب شائع ہو جانے کے بعد کسی اچھے سنگر کی آواز میں یہ نظمیں گائی بھی جائیں''۔

گیتا نجلی کے شروع کے تین اشعار دیکھیں:

تیری مرضی بنایا تو نے لا محدود مجھ کو بھی
یہ عزت بخش دی ہے اے مرے معبود مجھ کو بھی
مری ہستی تو سچ مچ اک بہت کمزور پیالہ ہے
اسی پیالے میں میری زندگی بھر کا نوالہ ہے
تو خالی بھی کرے اور پھر اسی پیالے کو بھرتا ہے
نئی اک زندگی تو خود اسی پیالے میں دھرتا ہے

انور جلال پوری نے صرف ہندو مذہب اور بنگلہ کلچر ہی کا مطالعہ نہیں کیا تھا بلکہ اپنے مذہب یعنی اسلام کا بھی ان کا مطالعہ بڑا زبردست تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ مذہبی ذہنیت کے انسان تھے۔ انھوں نے قرآن مجید کے تیسویں پارے کا بھی منظوم ترجمہ کیا ہے جس کا نام انھوں نے بہت برمحل ''توشہ آخرت'' رکھا ہے۔ قابل ذکر ہے کہ جن تین کتابوں یعنی اردو شاعری میں گیتا، اردو شاعری میں گیتا نجلی اور توشہ آخرت کا ذکر کیا گیا یہ تینوں ہندی زبان میں بھی شائع ہوئی ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری میں رباعیات خیام کے نام سے عمر خیام کے رباعیوں کا منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔ ان رباعیوں کا بھی ہندی ترجمہ شائع ہوا ہے۔ گویا انھوں نے اردو کی اپنی متعدد کاوشوں کو ہندی کے قالب میں ڈھال کر اہل ہندی کے لیے ایک بہترین تحفے کا انتظام کر دیا ہے۔

اس کے علاوہ ان کی تخلیقات میں جاگتی آنکھیں، خوشبو کی رشتہ داری، کھارے پانیوں کا سلسلہ، پیار کی سوغات، ادب کے اکثر اور چنندہ اشعار (غزلیں اور نظمیں)، روشنائی کے سفیر، اپنی دھرتی اپنے لوگ، قلم کا سفر، سفیران ادب (مضامین کے مجموعے) اور ضرب لا الہ، جمال محمد، بعد از خدا، حرف ابجد اور راہرو سے رہنما تک (نعتیہ مجموعے) قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ملک زادہ منظور احمد پر بھی ایک کتاب مرتب کی ہے جس میں مختلف قلمکاروں کے مضامین شامل ہیں۔ خود ان کی شخصیت اور فن پر بھی کئی کتابیں تصنیف کی گئی ہیں۔ جن میں ان پر دو اسکالروں کے پی ایچ ڈی مقالے بھی شامل ہے۔

اب ان کے کچھ دوسرے رنگ کے اشعار بھی ملاحظہ فرمالیں:

نہ یہ دن نہ یہ رات باقی رہے گی
بس اللہ کی ذات باقی رہے گی
نہ گردش میں صدیوں زمانہ رہے گا
سدا تو کسی کا نہ سکہ چلے گا
ہمیشہ نہ کوئی جنازہ اٹھے گا
نہ خوشبو کی برسات باقی رہے گی
نہ یہ دن نہ یہ رات باقی رہے گی
بس اللہ کی ذات باقی رہے گی

◆◆◆

زلف کو ابر کا ٹکڑا نہیں لکھا میں نے
آج تک کوئی قصیدہ نہیں لکھا میں نے
جب مخاطب کیا قاتل کو تو قاتل لکھا
لکھنوی بن کے مسیحا نہیں لکھا میں نے
میں نے لکھا ہے اسے مریم و سیتا کی طرح
جسم کو اس کے اجنتا نہیں لکھا میں نے
رات بھر ان بند آنکھوں سے بھی کیا کیا دیکھنا
دیکھنا اک خواب اور وہ بھی ادھورا دیکھنا
گلوں کے بیچ میں مانند خار میں بھی تھا
فقیر ہی تھا مگر شاندار میں بھی تھا

انور جلال پوری صرف شاعر اور ناظم مشاعرہ ہی نہیں تھے بلکہ ایک صاحب طرز نثر نگار بھی تھے۔ البتہ انھوں نے اپنی پوری زندگی مشاعروں کی نذر کر دی۔ اسی دشت کی سیاحی میں پوری عمر گزار دی۔ اس سیاحی نے ان کو ایک مشاہداتی نظر عطا کی جو ان کے علم و وجدان میں

اضافہ کا سبب بنی۔ان کی نظر کسی بھی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتے وقت صرف بیرونی عناصر کا ہی احاطہ نہیں کرتی بلکہ درونِ ذات کے پردوں کو بھی چاک کر دیتی تھی اور وہ سب کچھ دیکھ لیتی تھی جو عام نظر نہیں دیکھ پاتی۔ان کا قلم مشاہداتِ ذات کو اس طرح صفحہ قرطاس پر بکھیر دیتا تھا کہ ایک بے حد خوبصورت تصویر ہمارے سامنے آجاتی تھی۔انور جلال پوری جس کے بارے میں لکھتے اس کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کا احاطہ کرتے اور شخصیت کے مثبت و منفی دونوں پہلوؤں کو پیش کر دیتے۔ لیکن اس حوالے سے وہ دیانت داری کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیتے اور جو کچھ مشاہدہ کرتے اسے بلا کم و کاست ہمارے سامنے رکھ دیتے۔لیکن اس انداز میں کہ کسی بھی جملے میں صاحب تذکرہ کے تعلق سے ذم کا کوئی پہلو نہیں نکلتا نہ ہی بیجا تنقید کا کوئی تاثر ہی پیدا ہوتا۔اسی کے ساتھ ساتھ وہ دوستانہ تعلق کو قلم پر حاوی نہیں ہونے دیتے اور نہ ہی کسی ستائشی جملے سے خوشامد یا بیجا طرفداری کا ہی کوئی پہلو نکلتا تھا۔جب وہ لکھتے تو ان کا قلم تعصب و تنگ نظری سے بالکل پاک ہوتا اور وہ جو کچھ لکھتے اس میں خلوص کا عمل دخل ہوتا۔

وہ اپنی کتاب ''روشنائی کے سفیر'' میں، جس میں 21 مضامین ہیں، عمر قریشی کا سراپا یوں بیان کرتے ہیں ''سانولا رنگ، بوٹا سا قد، ہندوستانی جمہوریت کی صدارت کی شرطوں کو پوری کرتی ہوئی عمر، آنکھوں میں خود اعتمادی کا نشہ اور پیشانی پر تہذیب و شرافت کی چمک، گفتگو میں شہد کی مٹھاس اور نشست و برخاست میں اردو تہذیب کے ماضی کے نگار خانے کی جھلک''۔یہ تو ہوا ان کا ظاہری سراپا۔وہ ان کی شخصیت کے دوسرے یعنی باطنی پہلو پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''یہ دوسرا رخ عمر صاحب کی شخصیت کی قدر و قیمت کا تعین کرتا ہے۔ یہ رخ افسانوں کی تہوں میں چھپی ہوئی حقیقت کے چہرے کو بے نقاب کرتا ہے۔یہ رخ عمر صاحب کی چمک دار شخصیت کے سینے میں پرورش پانے والے رنج والم، دکھ اور کرب، انتشار اور ہیجان کا نمائندہ ہے۔یہی رخ ان کی شہرت کو استقلال اور ان کی مقبولیت کو استحکام عطا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔اور یہی رخ عمر صاحب ہی کے لیے نہیں بلکہ کسی بھی صاحب فن کے لیے شہرت عام اور بقائے دوام کا سبب بنتا ہے۔یہ رخ ہے ان کے شاعرانہ شعور، ان کی فنی مہارت اور ان کی فکری بصیرت کا۔ اس منزل پر بھی عمر صاحب کا کردار دوسرے شعرا کے مقابلہ میں ایک ستون عظمت دکھائی دیتا ہے''۔یہ دونوں اقتباسات عمر قریشی کی شخصیت کو اس قدر کھول کر بیان کر دیتے ہیں کہ اگر انور صاحب نے ان کے بارے اس کے علاوہ اور کچھ نہ لکھا ہوتا تب بھی عمر قریشی کی شخصیت مکمل ہو جاتی۔

انور جلال پوری کی خوبصورت نثر کا ایک اور نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔وہ بشیر بدر کا تعارف یوں کراتے ہیں ''دبلا پتلا بدن، جسم پر بہت ہی معمولی کپڑے کا پینٹ اور کوٹ، آنکھوں پر چشمہ جس کا فریم اپنے پرانے پن کی خود ہی گواہی دے رہا ہے۔دانت بڑے، سفید اور چمکیلے جنھیں ہونٹ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود بھی چھپانے میں ناکام تھے۔پچکے ہوئے گال جوان کی اقتصادی کمزوری کے مظہر تھے۔پیشانی قدرے کشادہ جسے دیکھ کر کوئی بھی قیافہ شناس ان کے مستقبل کو پڑھ سکتا تھا۔سر کے بالوں کی تعداد اتنی کم، جنھیں دیکھ کر یقین ہوتا تھا کہ یہ شخص دن میں تھکتا ہے اور راتوں میں جاگتا ہے''۔

(یہ ۱۹۶۵ء کے بشیر بدر کا سراپا ہے جب وہ مملکت سخن میں نئے نئے داخل ہوئے تھے اور مقام ہے مشرقی اتر پردیش کا ادب نواز قصبہ صبر حد)۔

اب یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں: ''پہلی ہی نظر میں وہ آنکھوں میں سما گیا۔دل میں اتر گیا۔ایسا شاید اس لیے ہوا کہ اس کی صورت، اس کی ہیئت اور اس کا پورا وجود عام شعرا سے مختلف تھا۔اس کی آنکھوں سے بغیر پیے ہی نشہ چھلک رہا تھا۔میں سوچنے لگا کہ پینے کے بعد کیا ہوگا۔ اس کے بال بہت گھنے تو نہیں تھے لیکن ان میں سیاہ ریشم کی چمک تھی۔ دانت اتنے سفید اور چمکیلے جیسے پان، کتھا، چونا، ڈلی اور تمباکو سے ان کا تعارف ہی نہ ہوا ہو۔پیشانی اتنی کشادہ جس کی لکیروں پر اس کے روشن مستقبل کی تحریریں پڑھی جا سکتی تھیں۔قد اتنا مناسب کہ ہزاروں کے مجمع میں اپنے امتیاز کو قائم رکھ سکے۔مگر رنگ ایسا جسے دیکھ کر افریقہ کے

درجنوں ملکوں کے سربراہوں کے چہرے نظر میں گھوم گئے۔لیکن نگاہ تصور جا کر ٹھہر گئی رضیہ سلطان کے تاریخی عاشق یاقوت پر.....کاش یہ شخص پہلی مرتبہ کسی مذہبی جلسے میں ملا ہوتا تو میں خود اس سے پوچھنے کی جسارت کرتا کہ آپ کا شجرۂ نصب حضرت بلال حبشیؓ سے تو نہیں مل رہا ہے۔مگر وہ جس عالم میں ملا تھا مجھے یہی شبہ ہو رہا تھا کہ اس شخص نے پہلا سپارہ بھی پڑھا ہے یا نہیں''۔آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ یہ راحت اندوری کے علاوہ کسی اور کا سراپا نہیں ہوسکتا کسی اور کا تعارف نہیں ہو سکتا۔یہ اقتباس ''راحت۔میرا یار'' نامی مضمون سے لیا گیا ہے۔

خمار بارہ بنکوی کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ انھیں آبروئے غزل کہا جاتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ جگر مرادآبادی کے ورثے کے امین تھے اور اپنی پوری تخلیقی قوت کے ساتھ اس کی حفاظت کر رہے تھے۔خمار کی شخصیت سے انور جلال پوری بھی متاثر ہیں اور ان کے کلام کو وہ بھی پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر آپ خمار صاحب کی وہ غزلیں پڑھیں جو انھوں نے کسی مشاعرے میں اپنے مخصوص انداز میں نہیں سنائی ہیں تو آپ کو کوئی لطف نہیں آئے گا۔انور جلال پوری کے الفاظ میں: ''خمار صاحب کے افکار میں نہ تو گہرائی تھی نہ وسعت۔یہی ان کی کمزوری تھی اور یہی ان کی خوبی۔اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شاعر فکر کی گہرائی اور وسعت کے چکر میں اپنی شاعری کے ساتھ انصاف نہیں کر پاتا۔وہ یا تو گہرائی میں ڈوب جاتا ہے یا وسعت میں کھو جاتا ہے۔یعنی نہ تو وہ لہجے کی حفاظت کر پاتا ہے نہ ڈکشن کا تحفظ۔خمار صاحب نے اپنے افکار کا ایک دائرہ متعین کر رکھا تھا۔انھوں نے اپنی سوچ کی ایک لکشمن ریکھا بنا رکھی تھی''۔

انور جلال پوری کا یہ انداز تحریر ان کے ہر مضمون میں موجود ہے۔خواہ وہ ملک زادہ منظور احمد کے حوالے سے باتیں ہوں یا مشاعروں کی قومی یکجہتی کی ضمانت سے متعلق گفتگو ہو۔ملک زادہ منظور احمد کے بارے میں ان کی اس رائے سے شاید ہی کوئی غیر متفق ہو کہ ''مشاعروں سے ڈاکٹر صاحب کا تعلق وہی ہے جو تاج محل سے شاہ جہاں کا۔جس طرح یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ تاج محل زیادہ خوبصورت ہے یا شاہ جہاں کے ذہن کی تخئیل۔اسی طرح یہ بھی فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ آزادی کے بعد ہمارے ملک میں مشاعرے زیادہ مقبول ہوئے یا ملک زادہ منظور احمد کا انداز تعارف۔مشاعرے کو ادب اور تہذیب کا جز بنانے میں ڈاکٹر صاحب کا جو کردار ہے اسے جدید ہندوستان میں ادب اور کلچر کا مورخ ہمیشہ جلی حروف سے لکھے گا''۔

سیدھی اور سچی بات یہ ہے کہ انور جلال پوری نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس کے بارے میں نہ تو مرعوبیت کا طعنہ دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی تنقید و تنقیص کا الزام لگایا جا سکتا ہے۔انھوں نے نہ تو کسی کے ساتھ زیادتی کی ہے اور نہ ہی کسی کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔چشمے کے اندر سے جھانکتی ہوئی سرمگیں آنکھوں نے جو کچھ دیکھا ہے، جو کچھ پرکھا ہے اور انھوں نے جو کچھ برتا ہے وہ حشو و زوائد سے پاک اور بلاکم و کاست اس کتاب میں موجود ہے۔انتہائی معروضی مگر دلچسپ انداز میں شخصیات کا خاکہ انھوں نے کھینچا ہے۔بعض مقامات پر والہانہ پن آ گیا ہے لیکن اس کے باوجود انصاف کا ترازو کسی ایک پلڑے کی جانب جھکنے نہیں پایا ہے۔

انھوں نے ابھی کچھ دنوں قبل اپنی منظوم کتابیں اور نعتیہ مجموعے انتہائی محبت کے ساتھ میرے پاس بھیجے تھے اور یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ میں ان کی منظوم ترجمہ نگاری پر کچھ خامہ فرسائی کروں۔مجھے افسوس ہے کہ میں ان کی زندگی میں ان کی یہ خواہش پوری نہیں کر سکا۔میں انھیں کے ایک شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں:

میں جا رہا ہوں مرا انتظار مت کرنا
مرے لیے کبھی دل سوگوار مت کرنا



گنگا جمنی تہذیب کی طرح پاکیزگی کا احساس کراتی ہے

انور جلالپوری کی شاعری

ڈاکٹر اختر ریاض
(آئی.اے.ایس)
ایڈیشنل کمشنر۔جھانسی
موبائل نمبر9918226052

یوں تو انور صاحب رشتے میں میرے ماموں تھے لیکن فن شاعری میں وہ میرے استاد بھی رہے ہیں۔اپنی شاعری کے شروعاتی دور میں ان کے ساتھ کافی وقت گزرا اور اس دور کی میری کچھ غزلوں پر انہوں نے اصلاح بھی کی تھی،لیکن سرکاری ملازمت کی جملہ مصروفیات کے سبب بعد میں ان سے کم ہی ملاقات ہو پاتی تھی۔حالانکہ کئی ضلعوں میں میری تقرری کے دوران جب وہ مشاعروں میں شرکت کرنے کے لیے وہاں آتے تھے تو میری اور ان کوشش رہا کرتی تھی کہ زیادہ تر وقت ایک دوسرے کا قرب ہمیں میسر ہو سکے۔ان کی شخصیت اور ان کی شاعری ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ دور ہو کر بھی ہمیشہ میرے دل و دماغ پر چھائے رہے۔زندگی تقریباً پانچ دہائیوں کا سفر ادب کی شاہ راہوں اور منزلوں کے ارد گرد گزارنے والے انور صاحب نے ۶؍جولائی ۱۹۴۷ء کو اتر پردیش کی تحصیل جلال پور ضلع امبیڈکر نگر میں آنکھیں کھولیں اور ۲؍جنوری ۲۰۱۸ کو لکھنؤ کے ٹراما سینٹر میں دائمی اجل کو لبیک کہا۔یہاں اس بات کا ذکر کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ انتقال سے چار پانچ دن قبل ان سے میری ٹیلیفون پر تفصیلی گفتگو ہوئی تھی اور اسی دوران مجھے یہ معلوم ہوا کہ ان کی بیٹی نزہت کا لندن میں انتقال ہو چکا ہے۔اور چالیسواں کے سلسلے میں وہ صبح جلالپور جا رہے ہیں۔اس کے بعد ہماری اور ان کی ملاقات متوقع تھی مگر یہ شاید اوپر والے کو منظور نہ تھا۔دوران گفتگو مجھے یہ محسوس ہوا کہ وہ اپنی بیٹی کی موت کے صدمے کے کرب سے گزر رہے ہیں اور ان کی آواز میں لرزش بھی تھی۔حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا بوجھ باپ کے کاندے پر اولاد کا جنازہ ہوتا ہے یہ اچھے اچھوں کو توڑ ڈالتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ انور صاحب نے اپنے علم و فن کے ذریعہ ساری دنیا میں اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں جگہ بنائی تھی۔انہوں نے عمر تو کوئی ایسی بہت طویل نہیں پائی۔لیکن ان کی مقبولیت کا پیمانہ یہ رہا کہ چار پیڑھیوں نے ان کی غزلوں کو گنگنایا ہے۔جہاں جہاں ہندی اور اردو زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں وہاں وہاں کے ادبی حلقوں میں انور صاحب کی رسائی تھی اور انہیں اردو کے ساتھ ساتھ ہندی اور انگریزی یہاں تک کہ سنسکرت زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ان کی زیادہ تر تخلیقات بھلے ہی اردو زبان میں ہیں اور زندگی کا زیادہ تر وقت انہوں نے اردو ادب کی نوک پلک اور اردو غزل کی زلفیں سنوارنے میں گزارا،لیکن کالج میں لیکچرر وہ انگریزی زبان کے تھے اور اکثر و بیشتر انگریزی ادب کے شاعروں جیسے Byron , Keats , P.B. Shelly Wordsworth, B. Johnson وغیرہ کی شاعری کا ترجمہ اردو زبان میں کرنے کے بعد ہم طالب علموں کو class room میں سنایا بھی کرتے تھے۔تقریباً ستر سال کی عمر میں زندگی کو الوداع کہنے والے انور صاحب نے بہت کم عمر میں ہی شاعری کا دامن تھام لیا۔جب وہ انٹر میں پڑھ رہے تھے تب ہی سے انہوں نے اسٹیج پر تقریر کرنے اور نظامت کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔عام طور پر مشاعروں میں شاعر کو ادب میں وہ مقام حاصل نہیں ہو پاتا لیکن انور صاحب کی خوبی یہ تھی کہ ادب اور مشاعروں کے انہیں ایک جیسی مقبولیت حاصل ہوئی۔شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی کہ وہ ایک بہترین شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ

زبردست ناظم بھی تھے۔اپنی مخملی آواز میں جب وہ مشاعروں کی نظامت فرماتے تو سننے والے اس میں ڈوب کر رہ جاتے تھے۔ان کا ادبی مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ کبھی کبھی جب خالص ادبی سامعین ان سے مخاطب ہوا کرتے تھے تو ان سے گفتگو کرتے وقت وہ یہ بھی بھول جایا کرتے تھے کہ مشاعرے کی فہرست میں ابھی کئی شعرا بھی کلام پڑھنے کے لیے باقی ہیں ۔ان کی ادبی گفتگو کے لیے سامعین میں ایسی دیوانگی دیکھنے کو ملتی تھی کہ وہ بھی مشاعروں کی جگہ انور صاحب کو سننے میں زیادہ دلچسپی لیا کرتے تھے۔

انور صاحب کی حالانکہ ''راہبر سے رہنما تک'' کو لیکر تقریباً آدھا درجن کتابیں منظر عام پر آئیں اور انہوں نے ''اکبر داگریٹ۔ٹی وی سیریل کے ڈائیلاگ بھی لکھے لیکن ربندر ناتھ ٹیگور کی 'گیتا نجلی' کے ساتھ ہی 'بھگوت گیتا' کا اردو زبان میں ترجمہ کر کے انہوں نے نہ صرف سبکو حیرت میں ڈال دیا بلکہ ادب میں اپنے لیے ایک خاص جگہ بھی بنالی کیونکہ یہ کارنامہ صرف وہی ادیب یا شاعر انجام دے سکتا تھا جس کی اردو کے ساتھ ساتھ ہندی اور سنسکرت زبان پر بھی گہری نظر رہی ہو۔'گیتا نجلی' اور بھگوت گیتا' کا اردو زبان میں ترجمہ کر کے انہوں نے ایک طرح سے دونوں مذاہب کے لوگوں کے درمیان ادبی پل بنانے کا کارنامہ انجام دیا جس کی اس دور میں بہت ضرورت بھی ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ دریائے گنگ وجمن کی طرح ہی انور صاحب کی شاعری بھی پاکیزگی کا ایسا احساس ہے کہ جس میں ہندوستانی تہذیب انگڑائیاں لیتی نظر آتی ہیں'' اردو شاعری میں گیتا'' اور'' گیتا نجلی'' جیسے بے مثال ادبی اور دلوں کو جوڑنے کے زندہ جاوید کارناموں کی بدولت انہیں تمام ایوارڈ واعزاز بھی ملے جنہیں اتر پردیش سرکار کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ 'یش بھارتی'' بھی شامل ہے۔مرکزی حکومت نے بعد از مرگ انہیں'' پدم شری ''ایوارڈ دینے کا اعلان کیا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ انور صاحب گیتا پر Ph.D کرنا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں انہوں نے ۱۹۸۲ میں اودھ یونیورسٹی میں رجسٹریشن بھی کرا لیا تھا لیکن زندگی کی تگ و دو میں وہ اسطرح مصروف ہوئے کہ Ph.D مکمل نہ کر سکے۔لیکن جیسے ہی انہیں وقت ملا انہوں نے اردو شاعری میں گیتا جیسی کتاب پیش کرا پنا خواب مکمل کر لیا۔گیتا کا جو فلسفہ شری کرشن نے ارجن کے رو برو بیان کیا اس کی ایک چھوٹی سی مثال انہیں کے الفاظ میں پیش ہے۔

ادھر کرشن ارجن سے ہیں ہمکلام
سناتے ہیں روحانیت کا پیام
وہ کہتے ہیں ارجن سے ارے سوگوار
تو غم اوڑھ لیتا ہے کیوں بار بار
تری بات و گیان والی نہیں
کہیں سے یہ سمان والی نہیں
جو گیانی ہیں جینے پر مرتے نہیں
کبھی موت سے بھی وہ ڈرتے نہیں
یہ مٹی کی کایا حقیقت نہیں
بدن کی یہاں کوئی قیمت نہیں

اس سے آپ محسوس کر سکتے ہیں کہ جس زبان کا استعمال انور صاحب نے گیتا کے اشلوکوں کا ترجمہ اردو زبان شاعری میں کرنے کے لیے کیا ہے، وہ کتنی سادہ وسلیس ہے اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی شاعری میں ہندی کے بے شمار الفاظ اس طرح پرو دیئے ہیں کہ وہ اردو کے اپنے الفاظ معلوم ہوتے ہیں جیسے کایا، مایا، گیان، سمان، ساون اور درین وغیرہ۔

اس کے علاوہ زندگی کے فلسفہ پر جب بھی انہوں نے قلم اٹھایا تو اس طرح کے اشعار کی تخلیق ہوئی۔

کوئی پوچھے گا جس دن واقعی یہ زندگی کیا ہے
زمیں سے ایک مٹھی خاک لیکر ہم اڑا دیں گے
اگر تم آسماں پر جا رہے ہو شوق سے جاؤ
مرے نقش قدم آگے کی منزل کا پتا دیں گے

اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ان کا شعر کہنے کا انداز دلوں میں اتر جانے والا تھا اس لیے تو وہ اس طرح کے شعر کہنے میں کامیاب رہے ہیں۔

خواہش مجھے جینے کی زیادہ بھی نہیں ہے
ویسے ابھی مرنے کا ارادہ بھی نہیں ہے

انہوں نے اپنی زیادہ تر زندگی دوسروں کی مدد کرنے میں گزار ی۔انہوں نے اپنے ایک شعر میں اس خیال کو یوں پیش کیا ہے۔

عمر بھر زلف مسائل یو نہی سلجھاتے رہے
دوسروں کے واسطے ہم خو کو الجھا تے رہے

ان کی شاعری ایک طرح سے ان کی اپنی زندگی کی عکاسی کرتی ہے۔

برے وقتوں میں تم مجھ سے نہ کوئی رابطہ رکھنا
میں گھر کو چھوڑنے والا ہوں اپنا جی کڑا رکھنا

اس کے علاوہ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ باہمی محبت کے جذبے کو بھی ابھارنے کی شعوری طور پر کوشش کی ہے۔

تم پیار کی سوغات لیے گھر سے تو نکلو
رستے میں تمہیں کوئی بھی دشمن نہ ملے گا

اسی کے ساتھ ساتھ آج کا انسان جس طرح سے ٹوٹ کر بکھرتا ہوا نظر آرہا ہے اس کی بہترین عکاسی اس شعر کے ذریعہ انہوں نے کی ہے۔

دل کہیں جسم کہیں روح کہیں جان کہیں
آدمی ٹوٹ کر اس طرح سے بکھرا کبھی ایسا تو نہ تھا

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ انور صاحب کی شاعری میں شعور اور لا شعور کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔انہوں نے عربی اور فارسی کے ثقیل و ادق الفاظ کے استعمال سے ہمیشہ گریز کیا ہے اور اس لیے ان کی شاعری ہندوستانی مزاج اور روح کی آئینہ دار بن کر ابھری ہے۔مرا یہ ایک مختصر سا مضمون ایک طرح سے انور صاحب کے لیے ایک خراج عقیدت کی طرح ہے۔اگر وقت ملا اور زندگی نے ساتھ دیا تو آئندہ ان کی شاعری اور شخصیت پر تفصیلی کام انجام دینے کی کوشش کروں گا۔میں اس مضمون کو اس مصرعہ کے ساتھ یہیں پر ختم کرتا ہوں۔

اک دھوپ تھی سو وہ بھی گئی آفتاب کے ساتھ

غزل

راز اعظمی
سبز پوش ہاؤس، جعفر بازار۔گورکھپور
موبائل نمبر 7269943055

میدان کارزار میں تلوار میں ہی تھا
اے زندگی وہ تیرا خریدار میں ہی تھا
ناول کے پہلے باب میں جو قتل ہو گیا
اس قصۂ طویل کا کردار میں ہی تھا
سب لوگ اپنے اپنے خداؤں کے ساتھ تھے
تنہا ترے وجود کا اقرار میں ہی تھا
جب میں نہیں رہا تری عظمت نہیں رہی
اے حسن احتیاط کی دیوار میں ہی تھا
تخلیق کائنات ہوئی ہے مرے لیے
قدرت بھی جانتی تھی کہ شہکار میں ہی تھا
معصومیت کی تو نے سند دی ہر ایک کو
تیری نظر میں ایک گنہگار میں ہی تھا
اترا نہ مرے سر سے کبھی نشۂ انا
مصلوب ہونے والوں میں سرشار میں ہی تھا
یہ اور بات ہے مرا پھولوں پہ حق نہیں
لیکن کبھی چمن کا نگہدار میں ہی تھا
ہر آدمی ہے سنگ ملامت لیے ہوئے
شاید تمہارے شہر میں دلدار میں ہی تھا
میرے ہی خوشۂ چیں ہے اہل ہنر تمام
شہر سخن کو گرمیٔ بازار میں ہی تھا
اے رازؔ سامنے تھی مری منزل مراد
خود اپنی راہ شوق کی دیوار میں ہی تھا

اردو شاعری میں گیتا
اور انور جلالپوری



سنجے مصرا شوق

538KH/231 ڈاکٹر دین دیال نگر کھدر،

سیتا پور روڈ، لکھنؤ

موبائل نمبر 9795455187

پامال راہوں پہ چلنے والے، چھوٹے چھوٹے دائروں میں مقید رہ کر ہی مست مگن رہتے ہیں۔ جبکہ نکیلے پتھروں پر دیوانہ وار چل کر تلوؤں سے رسنے والے لہو کی فکر نہ کرنے والے ہی کسی بڑے دائرے کو جنم دے پاتے ہیں۔ انور جلال پوری ایک ایسے ہی دانشور ہیں جو علاقائی اور لسانی دائروں سے نکل کر، دل کی آواز پر بے خوف و خطر لکھتے ہیں اور بہت خوب لکھتے ہیں۔ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اُس کا حق ادا کرتے ہیں۔ محبت ان کا مسلک ہے۔ نفرت، تعصب اور تنگ نظری کی ہر دیوار کو وہ عزم و حوصلہ کی ٹھوکر سے منہدم کر دینے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ مختلف تہذیبوں اور زبانوں کا انھیں گیان ہے۔ نظامت کے حوالہ سے دنیا کے مختلف ترقی یافتہ ممالک کا سفر کر چکے ہیں۔ درس و تدریس سے طویل عرصہ تک تعلق کے سبب نسلوں کی آبیاری کا انھیں تجربہ ہے۔ قوموں کے عروج و زوال پر ان کی گہری نظر ہے۔ انگریزی کے ساتھ ہندی کے اچھے جانکار اور اردو کے فدائی ہیں۔ مذہب اسلام کی باریکیوں کی فہم کے ساتھ دوسرے مذاہب کا خاصا علم ہے۔ اس لئے جہاں وہ حمد باری تعالیٰ، نعت رسول اکرمؐ، مناقب اصحابؓ و اہلبیتؑ کہتے ہیں وہیں خلفائے راشدین کی منظوم تاریخ رقم کر کے ایک نئے باب کا اضافہ کرتے ہیں۔ قلم کی پیاس نہیں بجھی تو وہ ''اردو شاعری میں گیتا'' عنوان قائم کر کے چہار سمت علم و عمل کی روشنی بکھیرنے کی سعی جمیل کرتے ہیں۔ یہ کام ہر چند کہ نیا نہیں مگر فنکار کے خلوص، وسعت نظر اور دائرے سے نکل کر کام کرنے کے جذبے کا بیّن ثبوت ضرور ہے۔ نیز آج کے ہندوستان میں ماضی سے کہیں زیادہ اس طرح کے کاموں کی اہمیت، افادیت اور ضرورت ہے۔

شری مد بھگوت گیتا کے لفظی معنی ہیں'' پرمیشور کا گیت'' اور پرمیشور کا گیت سب کے لئے ہے یعنی تمام انسانیت کے لئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانیت صدیوں سے اس سے فیضیاب ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ دراصل زندگی جینے کی کلا کا نام ہی گیتا ہے۔ آئندہ بھی پر کیف زندگی اور کامیابی کی کنجی گیتا ہے۔ گیتا کا صحیح گیان نعمتِ عظمیٰ ہے۔ جسے یہ گیان حاصل ہو جائے اور وہ دنیا کو اس گیان سے واقف کرانا اپنا اخلاقی فریضہ سمجھے وہ عام آدمی کی صف سے نکل کر اہم ہو جاتا ہے۔

شری مد بھگوت گیتا کسی ایک مذہب کی کتاب نہیں ہے اس لئے تمام مذاہب کے لوگ اسے اپنا کر زندگی کرنے کا ہنر سیکھتے ہیں اور کامیاب زندگی گزار کر پرم آنند کو پراپت ہوتے ہیں۔ شری مد بھگوت گیتا میں جو سب سے ضروری پیغام دیا گیا ہے وہ کرم کا ہے یعنی عمل کا۔ عمل ہر جیون دھارا کے لئے ضروری ہے۔ عمل سے ملنے والے پھل کی فکر کئے بغیر عمل کرنا ضروری ہے۔ پھل کو سامنے رکھ کر عمل کرنا تو سودے بازی کے زمرے میں آتا ہے۔ اس لئے پھل کی چنتا کے بغیر کئے گئے عمل ہی کو سچا عمل بتایا گیا ہے جیسے کامیابی کی ضمانت مانا جاتا ہے۔ رشتے کی پاکیزگی، انسانیت کا تحفظ، زندگی کو بہتر بنانے کا علم، خدا اور بندے کو قریب کرنے کا ذریعہ بھی شری بھگوت گیتا ہے۔

شری مد بھگوت گیتا اس وقت وجود میں آئی جب حق اور باطل کی

سب سے بڑی جنگ کورو پانڈو یو کے روپ میں مہابھارت بن کر ہمارے سامنے آئی۔مہابھارت کی جنگ ایک ایسی جنگ ہے جو پوری انسانیت کے لئے ایک درس حاصل کرنے والی گھٹنا ہے۔جس میں ۱۰۰ کوروؤں اور پانچ پانڈوؤں کے بیچ زمین کا مسئلہ بنیادی شکل میں ابھر کر سامنے آیا ہے۔دھرت راشٹر کے پتر پریم کے علاوہ مسئلہ دروپدی کے دریودھن کو اندھے کا بیٹا اندھا کہہ کر بے عزت کئے جانے کا بھی ہے۔ مہابھارت جس کا پرتی شودھ ہے۔اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مسئلہ صرف زمین کا ہی نہیں تھا۔باطل پرست دریودھن کے حق پرست پانڈوؤں کے وجود کو نکارنے،سوئی کے برابر بھومی نہ دینے اور اہنکار کا غلام بن کر خدائی کو چیلنج کرنے کا ہے۔غلط راہ پر چل کر دنیا کے ایک ویر یودھا کے ہوتے ہوئے بھی اسے شکست کا سامنا اور اپنی جان گنوانی پڑی۔

شری مدبھگوت گیتا اس وقت وجود میں آئی جب میدانِ جنگ میں ارجن کو یہ بھرم ہو گیا کہ وہ ان اپنوں سے، ان رشتہ داروں اور گروجنوں سے جنگ پر آمادہ ہے جن کی گود میں پل کر وہ بڑا ہوا ہے اور جیون کے ساتھ ہی جنگ کا ہنر بھی سیکھا ہے۔جب وہ میدان کے بیچ جا کر دھنش اور باڑھ رکھ دیتا ہے تب بھگوان شری کرشن اسے اپدیش (پیغام) دیتے ہیں۔یہ اپدیش یعنی پیغامات ہی شری مدبھگوت گیتا کے نام سے جانے جاتے ہیں۔جنھیں سن کر ارجن کو گیان پراپت ہوتا ہے اس کا موہ اور بھرم دور ہو جاتا ہے اور وہ جنگ کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔دراصل یہ جو اپدیش (پیغامات) ہیں یہی تمام انسانیت کا سرمایہ ہیں۔جس میں عمل سے منھ موڑنا سب سے بڑا جرم بتایا گیا ہے۔

اردو شاعری میں گیتا حضرتِ انور جلال پوری کا ایسا کارنامہ ہے جس نے اپنی زبان و بیان کی خوبی سے شری مدبھگوت گیتا کے ہر پڑھنے والے کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔انور جلال پوری انگریزی کے استاد رہے ہیں۔ثقافتی پروگراموں کے ناظم۔۱۷ کتابوں کے مصنف ہیں۔بڑے دانشور اور سانجھا سنسکرتی کے علمبرداروں میں سے ایک ہیں۔گیتا کا ان کے دل و دماغ پر گہرا اثر ہے۔انھوں نے برسوں گیتا کو پڑھا اور اس کے گوڑ رہسیوں کو سمجھ کر عام فہم، سادہ اور سلیس زبان میں بات کو پیش کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی منظوم کاوش ''اُردو شاعری میں گیتا'' کی ہر سمت مانگ ہے۔

انور جلال پوری اردو شاعر ہیں، سو اردو'' شاعری میں گیتا '' لکھنا انھوں نے ضروری سمجھا۔کیونکہ کہیں نہ کہیں وہ چاہتے تھے کہ اردو والے بھی گیتا کو با آسانی پڑھ اور سمجھ سکیں۔ویسے تو شری مدبھگوت گیتا کے اب تک ۸۲ ترجمے ہو چکے ہیں جس میں تقریباً ۱۵ منظوم ہیں۔ لہٰذا ۱۷ کتابوں کے مصنف انور جلال پوری نے شری مدبھگوت گیتا کے ۱۸ ادھیایوں کو باقاعدہ سلسلہ وار ترجمہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس سے پہلے بھی اردو شاعری میں گیتا کے ترجمے ہوئے ہیں لیکن وہ سبھی ترجمے قطعات کی شکل میں ہوئے ہیں اس طرح فارم میں نہیں ہوئے جیسا کہ انور جلال پوری نے کئے ہیں اور نہ ہی اتنے عام فہم کہ عام قاری کو بھی آسانی سے سمجھ میں آ سکے۔اُردو شاعری میں گیتا کو پیش کرنے کیلئے انور جلال پوری نے گیتا کی کہانی کو نثر میں پڑھنے والوں کے لئے آسان زبان میں پیش کرتے ہوئے اس میں آئے اہم حصوں کا بھی تعارف کرایا ہے تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو۔ہر باب کے پہلے نثر میں کچھ اشارے بھی دئے ہیں جسے مختصر تعارف کہا جا سکتا ہے۔

انور جلال پوری نے پہلے باب میں جنگ کے نقشے کو بآسانی اردو زبان کی چاشنی میں گھولتے ہوئے لکھا ہے:

وہ میداں جو تھا جنگ ہی کے لئے
وہیں سے چلے دھرم کے بھی دیئے
ہمیں فخر بھیشم پتا ما پہ ہے
کہ جن کا اثر ساری دنیا پہ ہے
مگر اپنے دشمن بھی کچھ کم نہیں
انھیں مرنے جینے کا کچھ غم نہیں
وہاں پانڈووں کی عجب شان ہے
کہ لاکھوں میں بھی ان کی پہچان ہے
وہ چمکے تو شرما گیا شیر بھی
وہ گرجے تو غش کھا گیا شیر بھی
پتا ما کے بجنے لگا شنکھ جب
تو میداں میں گھبرا گئے سب کے سب

وہی شنکھ جو آسمانی بھی ہے
حقیقت بھی ہے اور کہانی بھی ہے
وہی شنکھ پانچ جن ہے جس کا نام
دکھایا اسی شنکھ نے اپنا کام

مطالعہ کے شائقین کو ہر باب بلکہ ہر صفحہ پر وہی روحانی کیفیت ملے گی جو کہ پہلے باب کی پہلی سطر سے شروع ہوتی ہے۔ ہر باب دوسرے اور دوسرا تیسرے کو پڑھنے پر آمادہ کرتا رہے گا۔ اس طرح سلسلہ منقطع کئے بغیر کتاب ایک نشست میں ختم ہوجائے گی۔ پلک جھپکتے ۱۸/ابواب ختم ہوجائیں گے۔ یہی بھگوت گیتا کا کمال ہے کہ پڑھنے والا مزید تشنگی محسوس کرتا ہے۔ سیراب ہونے کی خواہش قدم بہ قدم آگے بڑھتے رہنے پر آمادہ کرتی ہے اور یہی آمادگی منزلِ مقصود تک پہونچنے کا سبب بنتی ہے اور ہر انسان بقدر ظرف واستعداد کسب نور کرتا ہے۔

انور صاحب کو شریمد بھگوت گیتا کو پڑھنے، سمجھنے اور اس کی مشتہری کے لئے صلاحیتوں کے استعمال کا موقع ملا ہے تو یہ معمولی سعادت نہیں ہے۔ اس خوش بختی پر انھیں جتنا نوازا جائے، جتنی اور جن الفاظ میں ستائش کی جائے کم ہے۔ میرے خیال میں ان کے پاس کوئی نہ کوئی روحانی طاقت ضرور ہے کہ وہ شاعری اور نظامت کے ساتھ مقدس موضوعات کا حق ادا کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ قدرت انھیں ان کی جدا گانہ کوششوں میں کامیابی بھی عطا کردیتی ہے جو ایک طرح سے سند قبولیت ہے۔

پدم شری گوپال داس نیرج انور جلال پوری کے منظوم ترجمے پر پسندیدگی کی مہر ثبت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔ ''میں نے گیتا کے ہندی اور انگریزی بھاشاؤں کے بھی کئی انواد پڑھے ہیں لیکن جیسا انواد شری انور جلال پوری نے کیا ہے ویسا مجھے انیتر کہیں دیکھنے کو نہیں ملا۔۔۔۔۔۔۔'' شری گوپال داس نیرج کے یہ الفاظ تو معمولی نہیں ہیں۔ انھوں نے اس کام کے لئے انو جلال پوری کو مبارکباد کے پھول بھی پیش کئے ہیں اور ایک طرح سے شاباشی بھی دی ہے۔

پروفیسر رمیش دکشت کی امیدیں بجا ہیں وہ کہتے ہیں۔ ''جناب انور جلال پوری کو بھاشا پر غضب کا نیتزن ہے۔ روانی ایسی ہے کہ گیتا کے شلوکوں کی پرت در پرت کھولتی چلی جاتی ہے۔ وہ کئی بار کسی ایک شلوک کو متعدد اشعار میں سپشٹ کرتے ہیں تاکہ پاٹھک کے لئے اس شلوک کا ارتھ سمجھنے میں آسانی ہو۔''

پنڈت ہنومان شرما عاجز ماتوی چونکہ شاعر ہونے کے ساتھ گہری عروضی نگاہ رکھتے تھے اس لئے ان کی رائے دوسروں سے مختلف ہے۔ انھوں نے وہ اسمائے گرامی بھی درج کئے ہیں جنھیں انور جلال پوری صاحب سے قبل گیتا کے منظوم ترجمے کی سعادت نصیب ہوئی۔ پنڈت جی وضاحتاً لکھتے ہیں۔ منظوم ترجمے کے لئے انور جلال پوری نے جس بحر کا استعمال کیا وہ ثقیل، دقیق اور بھاری بھرکم الفاظ کی متحمل نہیں ہے۔ یہ بحر ہے متقارب، جس کے اوزان ہیں۔ فعولن فعولن فعولن فعل۔ آنجہانی عاجر ماتوی نے انور جلال پوری کے اس کام کو اس حد تک پسند کیا کہ اسے اردو ادب میں ایک اضافہ سے تعبیر کیا اور لکھتے ہیں دنیائے اردو کبھی اس کارنامے کے لئے انھیں فراموش نہ کرسکے گی اور سدا عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے گی۔''

انور صاحب نے جن کتابوں اور شخصیات سے استفادہ کیا اُن کا فخریہ طور پر اقرار و اعتراف بھی کیا ہے جس سے ان کا قد صداقت پسندوں کی نظر میں بہر حال بڑھ گیا ہے۔ ''اردو شاعری میں گیتا'' ایسا کام ہے جس کو خوش اسلوبی، دلجمعی اور مہارت سے انجام دینے پر انور جلال پوری صاحب کی ہر دلعزیزی میں اضافہ ہوا ہے۔ دوسرے ممالک کے صاحبانِ نظر بھی التفات پر مجبور نظر آرہے ہیں۔ جس کی روشن مثال شکیل احمد صبر حدی ہیں جو کہ بحرین میں مقیم ہیں۔ بڑے تاجر ہونے کے ساتھ وسیع النظر اور کشادہ قلب ہیں۔ شری مد بھگوت گیتا کے منظوم ترجمے کی اشاعت میں اُن کا یوگدان ثابت کرتا ہے کہ وہ ادبی اور علمی کاموں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ مادیت کے اس دور میں یہ معمولی خوبی نہیں ہے۔



انور جلالپوری کی شاعری وقت کی آواز

ڈاکٹر بشریٰ بانو

ایسوسی ایٹ پروفیسر، مہیلا ودیالیہ ڈگری کالج، لکھنؤ

موبائل نمبر 9412578628

انور جلال پوری کی شناخت نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ملک میں بھی ایک کامیاب ناظم کے طور پر ہوتی ہے۔ انہوں نے مشاعروں کی نظامت کے ذریعہ فن نظامت کو بلندی عطا فرمائی۔ دراصل نظامت، خطابت کا ہی ایک حصہ ہے اور کامیاب ناظم وہی ہوسکتا ہے جو خطابت کے تمام فن سے واقف ہو اور انور جلالپوری خطابت کے فن سے پوری طرح واقف تھے۔ ان کے اندر کسی بھی اسٹیج سے نظامت کے فرائض کو انجام دینے کا ہنر بخوبی تھا مگر خصوصی طور پر مشاعروں کے لیے وہ جانتے جاتے تھے۔

مشاعروں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ناظم مشاعرہ کا کردار ادا کرنے کے لیے کسی ایسے خطیب کو مدعو کیا جاتا ہے جو تاریخ ادب سے بھی واقف ہو اور شاعری کے فنی امور کا ادراک بھی رکھتا ہو۔ ناظم مشاعرہ اپنے سامعین کے مزاج سے بھی واقف ہوتا ہے اور مشاعرے میں ضبط و نظم قائم رکھنے کے فن سے بھی واقف ہوتا ہے۔ اس کڑی میں انور جلالپوری اس فن کے مرد میدان جانے جاتے تھے۔ لیکن انور جلالپوری نے صرف ناظم مشاعرہ تک خود کو محدود نہیں رکھا۔ انور صاحب کہنہ مشق شاعر بھی تھے اور کامیاب مترجم بھی مگر نظامت کی مقبولیت کے آگے ان کے یہ دونوں فن دب کر رہ گئے وہ ایک ایسے شاعر تھے جو عصری تقاضوں کے مطابق اپنی غزلوں کو پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنے پہلے مجموعۂ کلام 'خوشبو کی رشتہ داری' کے دیباچے میں اپنے متعلق لکھتے ہیں:

''قدامت، ترقی پسندی اور جدیدیت کی ذہنی ورزشوں سے خود کو محفوظ رکھا۔''

انور جلالپوری نے مذکورہ جملے میں کہا ہے اس پر وہ خود عمل پیرا ہوتے نظر نہیں آتے جب ہم ان کے مجموعے مطالعہ کرتے ہیں تو رجحانات سے وہ اپنے کو محفوظ رکھنے کی بات کہتے ہیں ان سب کا اثر کسی نہ کسی طرح ان کی شاعری نے قبول کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ کسی تحریک سے زیادہ متاثرہ ہیں اور کسی سے کم۔

انور صاحب کی زبان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری کو استعارات و تشبیہات سے بوجھل نہیں ہونے دیتے۔ اسی مجموعہ کے دیباچے میں رقم طراز ہیں:

''میں ایک قصبے کا باشندہ ہوں گاؤں سے اپنا رشتہ توڑ نہیں پا رہا ہوں اور شہر سے اپنا تعلق استوار کرنے کی خواہش چھوڑ بھی نہیں پاتا ہوں۔ میں نے اپنی شاعری کی زبان کے کھردرے پن کو نستعلیق بنانے کی کوئی مصنوعی کوشش نہیں کیے۔ مجھے تاج محل کی دیواروں کی چمک و دمک کے مقابلے میں لال قلعہ کی فصیلوں کا کھردرا پن زیادہ اچھا لگتا ہے۔''

انور صاحب کا یہ اعتراف خود ان کی شاعری کی نشاندہی کرتا ہے۔ دراصل وہ عصری مسائل و موضوعات کا عرفان رکھتے ہیں اور اپنی شاعری کو اس عرفان کا ترجمان بنا دیتے ہیں۔

جو شخص زمانے کے خداؤں سے لڑا ہے
سقراط ہوا ہے کبھی سولی پہ چڑھا ہے

◆◆◆

خاردار راہوں سے دشمنی نہ کر لینا
پاؤں کے تلے مخمل دیر تک نہیں رہتا

◆◆◆

تم پیار کی سوغات لیے گھر سے تو نکلو
رستے میں تمہیں کوئی بھی دشمن نہ ملے گا

◆◆◆

انور جلالپوری کے اشعار نہ تو کسی تشریح کے محتاج ہیں اور نہ تنقید کے ۔ یہ بڑی وضاحت کے ساتھ خود کو قاری اور سامع کے سامنے پیش کر دیتے ہیں ۔ آدمی کیا ہے اور کس طرح سوچتا ہے اس پر کیا گزرتی ہے، وہ کس ماحول میں سانس لیتا ہے اور اس ماحول کو کون سا سبق دیتا ہے، یہ سارے عناصر انور صاحب کی شاعری میں ملتے ہیں ۔ ان کے اشعار کو وقت کی آواز سے تعبیر کرنا غلط نہیں ہوگا ۔ ان کی شخصیت سے اردو مشاعروں کو رنگ و آہنگ ملا جو زبان و ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے ۔

انور جلالپوری کی شاعری میں قومی یکجہتی اور انسان دوستی کے عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں ۔ ان کو اردو، ہندی، انگریزی، عربی اور فارسی پر دسترس حاصل تھی ۔ 'اکبردی گریٹ' سریل ان کے فن کا غماز ہے ۔ جلال پور میں ان کا قائم کردہ مرزا غالب ہائی اسکول طالب علموں کے لیے مشعل راہ ہے ۔ 'ضرب لاالہ'، 'حرف ابجد'، 'بعد از خدا جیسے حمدیہ اور نعتیہ مجموعے ان کی مذہب سے گہری وابستگی کا مظہر ہیں ۔ 'عم پارہ' ان کا منظوم ترجمہ ان کی گہری علمی و مذہبی افتاد کا ضامن ہے ۔ ترجمہ نگاری کے فن پر ان کو عبور حاصل تھا ۔ ''اردو شاعری میں گیتا''، ''اردو شاعری میں گیتا نجلی''، عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ کسی تعارف کے محتاج نہیں ۔ خلفائے راشدین کی منظوم سیرت ''راہبر سے رہنما تک'' مذہب سے گہری ان کی وابستگی کی نشاندہی کرتا ہے ۔ علاوہ ازیں 'خوشبو کی رشتہ داری'، 'جاگتی آنکھیں'، 'پیار کی سوغات' ان کے متعدد شعری مجموعے ہیں جس سے ان کی شعری بصیرت و فنی آگہی کا اندازہ ہوتا ہے ۔

شاعری کے علاوہ انور جلال پوری کے شعری سرمایہ بھی کم اہمیت کے حامل نہیں ہیں ۔ 'اپنی دھرتی اپنے لوگ'، 'قلم کا سفر' اور 'سفیران ادب' قابل ذکر ہیں ۔ انور جلال پوری کی حیات و خدمات پر غالباً دو لوگوں نے پی ایچ ڈی بھی کیا ہے ۔

مختلف مفکر ادب نے اپنی تحریروں میں انور جلال پوری کی علمی، ادبی، شعری شخصیت کو سراہا ہے ۔ اس کی تائید بھی کی ہے ۔ ان کے فکر و عمل کی گہرائی و گیرائی کو قبول کیا ہے جس کا اعتراف کرتے ہوئے ۔ ملک زادہ منظور احمد لکھتے ہیں:

''ادبی حوالے سے یہ بات انور جلال پوری پر پوری صادق آتی ہے کہ انہوں نے ناظم مشاعرہ کے کردار میں نہ صرف اردو کی لسانی جمہوریت کو وسیع کیا ہے بلکہ ایک خوش فکر شاعر کے روپ میں اپنے تہذیبی رویوں کی ادبی التزامات کے ساتھ ترجمانی بھی کی ہے ۔

ڈاکٹر بشیر بدر کا خیال ہے:

''جدید غزل کی شناخت میں اس کی نئی زبان روزمرہ کی لفظیات ہیں ۔ نئی غزل میں نئے لفظوں کی داخلی شخصیت کو غزل کی جگہ دینے کا کرشمہ چند ہی لوگوں کے حصے میں آیا ہے ۔ ان کامیاب شاعروں میں انور جلال پوری نے نئے اسلوب کی خوبصورت غزلیں کہی ہیں''۔

اس طرح بلا تامل یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انور جلالپوری کو اردو ادب کے کئی اصناف پر دسترس حاصل تھا ۔ وہ بیک وقت خطیب بھی تھے، ناظم بھی تھے ۔ شاعر بھی تھے، مترجم اور نثر نگار بھی تھے ۔ ان تمام اوصاف کے باوجود انہیں جو مقبولیت ملی وہ نظامت سے حاصل ہوئی ۔ حالانکہ انہوں نے بھگوت گیتا کا جب منظوم ترجمہ کیا اور کتاب شایع ہوئی تو اردو ادب میں لوگوں نے انہیں ایک کامیاب مترجم کے طور پر جانا اور پہنچانا بھی جب کہ گیتا کے منظوم ترجمے کی اشاعت سے قبل عم پارہ، گیتا نجلی اور عمر خیام کی رباعیات کا وہ منظوم ترجمہ کر چکے تھے اور کتاب بھی شایع ہو چکی تھی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بھگوت گیتا کے منظوم ترجمہ کی وجہ سے اب انور جلالپوری کی شناخت ناظم کے ساتھ ساتھ ترجمہ نگار کے طور پر بھی ملک میں ہوگئی اور اگر یہ کہا جائے کہ بھگوت گیتا کے منظوم ترجمہ سے ان کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوا تو غلط نہ ہوگا ۔ بلکہ کچھ وقت کے لیے یہ کتاب ان کی نظامت پر بھی بھاری پڑ گئی ۔

قلمکاروں سے گزارش ہے کہ اپنی تخلیقات ''ادبی نشیمن'' کی ای ۔ میل آئی ڈی پر ان پیج فائل میں بھیجنے کی زحمت کریں ۔ مضمون کے ساتھ فوٹو، مکمل پتا اور فون نمبر ضرور تحریر کریں ۔ اردو یونیکوڈ یا ان پیج ۳ فائل میں برائے کرم اپنے مضامین ارسال نہ کریں ۔

ادارہ

وادی فکر و فن کا کامیاب مسافر

ڈاکٹر محمد ثاقب
ارم یونانی میڈیکل کالج لکھنؤ

دنیا آنی جانی ہے، جو بھی یہاں آیا ہے اسے خالق و مالک کی جانب سے عطا کردہ مدت حیات پوری کر کے دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کرنا ہے۔ یہی نظام کائنات ہے اور اسی نظام کے تحت آباد انسانی دنیا میں آمد و رخصت کا سلسلہ جاری و ساری ہے اور قیامت تک خالق کائنات کا بنایا ہوا یہ نظام اسی طرح جاری رہے گا۔ مگر بقول شاعر۔

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کیلئے

گزشتہ 2 جنوری 2018 کو سال نو کے جشن کو اردو ادب کے جس کوہ گراں کی رحلت نے ماتم میں تبدیل کر دیا وہ شخصیت تھی جناب انور جلال پوری کی۔ دنیائے شعر و ادب خصوصاً مشاعروں کی عظمت و وقار کی ضمانت باور کئے جانے والے ادیب اور ادب کو برائے معاشرہ سازی استعمال کرنے اور برتنے کے ہنر سے آراستہ مثالی شخصیت تھی انور جلا پوری۔ انہوں نے ایک طرف سیرت و مناقب صحابہ کی منظوم تاریخ مرتب کی تو دوسری جانب ہندو مذہب کی مقدس کتاب 'بھگوت گیتا' کا اردو میں منظوم ترجمہ کر کے ساری دنیا کو یہ پیغام دیا کہ اس قسم کے مثالی کارناموں کے ذریعہ منتشر قوموں کو ایک دوسرے کے قریب کیا جا سکتا ہے۔ مرحوم کی وفات کی خبر لکھتے ہوئے بیشتر صحافتی اداروں نے انہیں شاعر سے زیادہ ناظم مشاعرہ کے ایک عہد کے خاتمہ کے طور پر خراج عقیدت پیش کیا ہے اور لکھا ہے کہ اردو کے معروف شاعر اور ناظم مشاعرہ انور جلال پوری کا انتقال ہو گیا۔ انور جلال پوری کے انتقال سے اردو دنیا میں غم و اندوہ کی لہر دوڑ گئی۔ ابھی کچھ عرصہ قبل ہی ان کی بیٹی کا انگلینڈ میں انتقال ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ بے حد مغموم تھے۔ انور جلا پوری نے بھگوت گیتا کا ترجمہ اردو میں کیا تھا۔ انھوں نے اپنے اس ترجمے کو اردو شاعری میں 'گیتا' کا نام دیا ہے۔ انور جلال پوری اس سے پہلے رابندر ناتھ ٹیگور کی 'گیتا نجلی' اور عمر خیام کی 'رباعیات' کا بھی اردو میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ انور جلال پوری کا کہنا تھا کہ انھوں نے یہ ترجمہ دونوں زبانوں ہندی اور اردو جاننے والوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے کیا ہے۔ اردو کے مشہور ادیب شارب ردولوی کہتے ہیں'' انور جلال پوری بہترین شاعر اور ناظم کے علاوہ ایک لاجواب انسان تھے۔ ان کی رحلت حسرت آیا اردو کے ساتھ ساتھ انسانیت کا بھی بڑا خسارہ ہے''۔ ہم نے اپنی تحریر کے ابتدا میں ہی شارب ردولوی کے خیالات کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انور جلال پوری صرف شاعر یا ناظم مشاعرہ ہی نہیں تھے، بلکہ ان کی ادبی تخلیقات اس بات کا بھرثبوت دیتے ہیں کہ انہوں نے اپنی نظموں اور غزلوں کے ذریعہ آدم گری، کردار سازی اور معاشرہ کی اصلاح کا مجاہدانہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کوئی پوچھے گا جس دن واقعی یہ زندگی کیا ہے
زمیں سے ایک مٹھی خاک لے کر ہم اڑا دیں گے

◆◆◆

جلائے ہیں دیے تو پھر ہواؤں پر نظر رکھو
یہ جھونکے ایک پل میں سب چراغوں کو بجھا دیں گے

◆◆◆

نہ جانے کیوں ادھوری ہی مجھے تصویر جچتی ہے
میں کاغذ ہاتھ میں لے کر فقط چہرہ بناتا ہوں

◆◆◆

میں اپنے ساتھ رکھتا ہوں سدا اخلاق کا پارس
اسی پتھر سے مٹی چھو کے میں سونا بناتا ہوں

◆◆◆

مرحوم اردو زبان کے ہی ماہر نہیں تھے، بلکہ وہ انگریزی، فارسی اور ہندی زبان اچھی طرح جانتے تھے اور انہیں برتنے کا خوبصورت ہنر بھی جانتے تھے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ مشاعروں کی مجلس میں ناظم مشاعرہ کی اہمیت ٹیم کے کیپٹن کی ہوتی ہے، جس طرح کیپٹن کے اندر یہ صلاحیت ہونی ضروری ہے کہ وہ اپنے کس کھلاڑی کو کہاں استعمال کر کے ٹیم کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی مہارت رکھتا ہو۔ ٹھیک اسی طرح شعروشاعری کی محفل کو کامیاب و کامران بنانے کیلئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کے اندر وہ خوبی ہو کہ کس مقام پر کس شاعر کو کھڑا کرنا ہے اور اس کے اندر یہ خوبی بھی ہونی ضروری ہے کہ پھوہڑ سامعین کی ہوٹنگ سے مشاعرے کی بے ہنگمی کو اپنے الفاظ وخطابات کے جادو چلا کر کیسے باہر نکال لایا جائے، جب ہم مرحوم انور جلال پوری کی مشاعروں کی نظامت کے طویل ترین سفر پر نظر دوڑاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے الفاظ ومعانی کے بے انتہا خزانے سے لبریز تھے، بلکہ حاضری اور سامعین کی جانب سے اٹھائی جانے والی آوازوں اور شوروغوغا کو ایک قابل وفائق استاذ کی طرح سمجھا بجھا کر مشاعرہ پر سناٹا طاری کر کے شاعر کو اپنے کلام سنانے کیلئے پرسکون ماحول دستیاب کرانے میں ہمیشہ کامیاب رہتے تھے۔ ناظم مشاعرہ کیلئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ دوران نظامت پر لطف محاوروں اور مہذب انداز بیان سے مشاعروں میں رنگ بھرنے کا کام جانتا ہو اور خوش گپیوں میں ڈوبے آہنگ ورنگ سے محفل قہقہ زار بنانے میں ماہر اور حاضر جواب ہونے کے ساتھ کسی بھی سوال کا جواب دینے کیلئے جملوں اور نثری تقریروں کے بجائے فی البدیہ اور برموقع اشعار سنا کر سامع کو مبہوت کر سکے۔ مرحوم انور جلا پوری کی رحلت کے بعد اگر ہر ادیب وشاعر اور ماہر لسانیات انہیں ایک کامیاب ناظم مشاعرہ کے طور پر یاد کر کے افسوس کا اظہار کر رہا ہے تو اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ یقیناً وہ اس خارزار وادی کے ایک کامیاب مسافر تھے۔

پروفیسر ارتضی کریم نے مرحوم کے بارے میں بجا کہا ہے ''نقیب مشاعرہ انور جلال پوری کی رحلت سے اردو دنیا اس جلال و جمال سے محروم ہوگئی جو ان کی شخصیت کا لاینفک حصہ تھے۔ ان کا انتقال اردو شعر و سخن کا ایک ناقابل تلافی خسارہ ہے۔ انور جلال پوری نے اپنی جادوئی نظامت سے جہاں سامعین کے دلوں کو مسخر کیا وہیں اپنی شاعری کے ذریعے ایک بڑے طبقے کو اپنا اسیر بنایا''۔

مرحوم کی غزلوں، نظموں اور دیگر اصناف شعری سے لے کر مشاعروں کی نظامت کے دوران بیان کئے طنز ومزاح میں بھی تخیل کا بحر بے کراں دیکھنے کو ملتا ہے، ورنہ موجودہ وقت میں صورت حال یہ ہے آج کی مجالس، محفلیں اور نشستیں اس بامعنی تخیل سے خالی ہوتی صاف نظر آرہی ہے، وہ تخیل جس سے زندگی اور تہذیب وثقافت کی پوری عمارت ڈھلی ہوتی ہے اور اس کے بغیر صرف لفاظی رہ جاتی ہے، باقی سبھی ضروری چیزیں زندگی سے رخصت ہوجاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو چیز انسان کی ترکیب میں ایک لازمے کی طرح گندھی ہوئی ہے، وہ تخیّل اور تخیّل کی صلاحیت ہے، انور جلال پوری اسی تخیل کے بادشاہ تھے۔ آج انسان، یا پورے انسان کی تلاش نہیں، جیسے دیو جانس کلبی کو تھی۔ آج صرف اس تخیّل کی تلاش ہے، دوسری بہت سی چیزوں کے ساتھ، انسان جس سے عبارت ہے۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں اردو کے جن سپہ سالاروں نے دنیا کو خیر آباد کہا ہے، ان کے بعد ایسا لگنے لگا ہے کہ اب ہم ایک ایسی سرزمین پر زندہ بچیہیں، جہاں سے تخیّل کا فور ہوتا جارہا ہے۔ یا شاید ڈر کر کہیں غائب ہوتا جارہا ہے!

اخبارات، رسائل، ٹی، وی چینلز، فلمیں، ہر میڈیم، جس میں انسانی زندگی اظہار پاتی ہے، تخیّل سے عاری ہو چکا ہے۔ ادب، شاعری، وغیرہ، میں، کہیں اس کے کھنڈر مل جائیں تو مل جائیں، ورنہ

وہاں بھی اس نے جگالی کی صورت اختیار کرلی ہے۔ جو کچھ پہلے لوگ سوچ اور خیال کر گئے، اسے بار بار بنا بگاڑ کر سامنے لایا جارہا ہے۔

مرحوم اپنی تخلیقات کے ذریعہ ملک کی آپسی یکجہتی کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے تھے اور معاشرے میں پھیلی برائیوں اور مذہب کے نام پر پھیلائے جارہے فتنوں کے بڑے مخالف تھے۔ مرحوم نے گنگا جمنی تہذیب، اور آپسی میل محبت کو دھیان میں رکھتے ہوئے بھگوت گیتا کا منظوم اردو ترجمہ کیا جس سے رہتی دنیا تک لوگ فیض یاب ہونگے اسکے علاوہ مرحوم نے 'راہ رو سے رہنما تک، ایک کتاب لکھی جس کو بہت سراہا گیا۔ مرحوم کی رحلت سے فکر وفن، علم وادب کی دنیا کو بہت نقصان پہنچا ہے ان کی ادبی خدمات رہتی دنیا تک زندہ اور جاوید رہیں گی اور پوری دنیا اس سے فیض حاصل کرتی رہے گی، البتہ انکی کمی اب رہتی دنیا تک پوری نہیں کی جاسکتی۔ ابھی چند برس پہلے ہی معروف ادیب وشاعر جناب جاوید قمر نے مرحوم انور جلال پوری کا ایک مختصر سا انٹرویو لیا تھا ،جس کے ابتدا میں مرحوم کی زندگی اور خدمات نرالے ڈھنگ میں پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''انور جلال پوری اردو دنیا کا ایک محبوب اور محترم نام ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ڈاکٹر ملک زادہ منظور کے بعد مشاعروں کی نظامت کے فن کو وقار اور اعتبار بخشا، وہ انور جلالپوری کی ہی ذات ہے۔ آج اردو دنیا میں جہاں جہاں بولی پڑھی اور سمجھی جاتی ہے لوگ ان کے نام سے واقف ہیں مگر ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم اردو والے انور جلالپوری کے دیگر کارناموں اور ادبی خدمات کے دوسرے اہم گوشوں سے بڑی حد تک ناواقف ہیں۔ ہم یہ تو جانتے ہیں کہ ایک ممتاز ومنفرد ناظم کے ساتھ ساتھ وہ بہترین شاعر بھی ہیں، لیکن اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود انہوں نے تصنیف وتالیف کا جو کام کیا ہے اس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ ان کی اب تک 14 کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کتابوں کی فہرست پر نظر ڈالیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تصنیف وتالیف کا سلسلہ کسی مخصوص دائرہ میں قید نہیں ہے۔

ایک طرف اگر وہ ''بعد از خدا'' کے عنوان سے پیغمبر اسلامؐ کی سیرت کا منظوم ترجمہ کرتے ہیں تو دوسری طرف بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ بھی۔ 'راہرو سے رہنما تک'' کے عنوان سے جہاں وہ خلفائے راشدین کی سیرت کو منظوم کرنے کا کارنامہ انجام دیتے ہیں تو ٹیگور کی مشہور زمانہ تصنیف ''گیتا نجلی'' کا منظوم ترجمہ بھی کرتے ہیں۔ ایک جانب قرآن کے تیسویں پارہ کو منظوم کرتے ہیں تو عمر خیام کی رباعیات کے مفہوم کا منظوم ترجمہ بھی پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ انور جلالپوری کثیر جہت شخصیت کے مالک ہیں اور تحریر وتقریر دونوں میدانوں میں اپنی انفرادیت اور ذہانت کا سکہ بٹھا رکھا ہے''۔

آخر میں ہم مرحوم انور جلال پوری کے چند اشعار کے ذریعہ انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

شاداب و شگفتہ کوئی گلشن نہ ملے گا
دل خشک رہا تو کہیں ساون نہ ملے گا
سوتے ہیں بہت چین سے وہ جن کے گھروں میں
مٹی کے علاوہ کوئی برتن نہ ملے گا
اب نام نہیں کام کا قائل ہے زمانہ
اب نام کسی شخص کا راون نہ ملے گا



گزارش

قلمکاروں سے گزارش ہے کہ اپنی غیر مطبوعہ تخلیقات ہی اشاعت کے لیے ارسال کریں۔
مطبوعہ تخلیقات قابل قبول نہیں ہو گی۔
ٹائپ شدہ مضامین کو ترجیح دی جائے گی

اردو ادب کا شہسوار

انور جلال پوری



مظفر اللہ خان

ریذیڈنٹ ایڈیٹر

روزنامہ راشٹریہ سہارا گورکھپور

موبائل: 8318698338

خود نمائی کے اس دور میں کوئی شخص سادگی کا پیرہن اوڑھ کر سامنے آتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ کیا اس کو زمانے کی ہوا نہیں لگی؟ تڑک بھڑک، نام ونمود اور شہرت کی بلندی کا ملمع چڑھائے چہروں میں ایک چہرہ سادگی بھرا نظر آتا ہے وہ ہے انور جلال پوری کا۔ ظرف ایسا کہ جیسے ثمر آور درخت بوجھ سے جھکے پڑ رہے ہوں اور علم ایسا کہ خود ساختہ استاد بھاگتے نظر آئیں۔ اردو ادب کا یہ شہسوار بھی آخر ہم سے جدا ہوگیا، ان کی یادیں اور ان کا فن ان کلام اور ان کی شگفتہ طرز تحریر سالہا سال تک لوگوں کے ذہن میں ان کی قدر شناسی کو محفوظ رکھے گی۔ لکھنؤ اور فیض آباد کے ہمسایہ ضلع امبیڈکر نگر کے جلال پور قصبے کے رہنے والے انور جلال پوری نے اپنی تخلیقات سے اس قصبے کو ملک گیر ہی نہیں بلکہ عالمی نقشے پر ممتاز مقام دلایا، یہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی شاعر کے قلم میں اتنی طاقت ہو کہ وہ اپنے ذہن میں القاء ہونے والے اشعار کے علاوہ الفاظ کو نثر کی شکل میں بھی خوبصورتی سے پیش کر سکے، انور جلال پوری معروف شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ نثر نگاری میں بھی امتیازی مقام رکھتے تھے۔

سرسید کے لگائے ہوئے تعلیمی گلشن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انور جلال پوری نے بھی فیض حاصل کیا تھا اور ان کی فطرت میں سادگی، اخلاق کی بلندی اور ہمدردی کا بیکراں احساس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پاکیزہ اور باہمی تعاون کے ماحول کی دین ہے، یوں تو لکھنؤ اور فیض آباد کی شائستگی ان کے خمیر میں کوٹ کوٹ کر بھری اور ان دونوں اضلاع کے بلند اقدار نے ان کے مزاج میں انکساری کی جوت جگادی تھی، انگریزی ادب میں علی گڑھ سے ایم، اے کرنے کے بعد بھی انہوں نے اپنی طرز زندگی اور اپنی گفتگو میں کبھی مغربی تہذیب کا شائبہ تک جھلکنے نہیں دیا، وہ مشرقی اقدار کے مکمل نمونہ تھے، اودھ یونیورسٹی فیض آباد سے انہوں نے اردو میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور اپنے وطن جلال پور کے این ڈی ڈگری کالج میں انگریزی کی تدریس میں مصروف عمل رہے، ان کی سادگی اور بے ریا سلوک سے نوارد بھی بے انتہا متاثر ہوتے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ جیسے چند ساعتوں کا یہ اجنبی شخص ان کا دیرینہ رفیق رہا ہو، انور جلال پوری اس بات کو بخوبی جانتے تھے کہ تخلیقات میں بلند پروازی کے لئے مطالعہ کا ہونا بہت ضروری ہے اس لئے وہ زندگی کے آخری لمحے تک گہرے مطالعے میں غرق رہتے تھے، نظامت کے فرائض بخوبی انجام دینے کے بعد وہ گھر پر آرام کرنے کیلئے پہنچتے تھے تو جب تک کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کر لیتے ان کو نیند نہیں آتی تھی، یہی سبب ہے کہ ان کے کلام میں زندگی کی حقیقتوں کو انتہائی گہرائی سے پیش کیا گیا ہے اور ان کی نثر بھی قاری پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے، اردو مشاعروں کو اپنے منفرد لب ولہجے اور پر لطف سادے انداز سے کی گئی نظامت سے وہ کامیابی کی دہلیز پر پہنچا دیتے تھے۔

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کی رحلت کے بعد اردو ادب کے شائقین کی نظریں انور جلال پوری پر ہی ٹکی ہوئی تھیں اور وہ اپنی ذمہ داری بخوبی انجام بھی دے رہے تھے لیکن فرشتۂ اجل نے ان کے ادبی سفر کے رتھ کو روک کر عدم آباد کی طرف ان کی روانگی کرادی۔ انہوں نے قرآن

کے تیسویں پارے کا منظوم ترجمہ 'توشۂ آخرت' کے نام سے کیا، ان کی غزلوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جن میں 'کھارے پانیوں کا سلسلہ' اور 'خوشبو کی رشتہ داری' کو جو شہرت ملی ہے اس کے لئے دیگر شعراء برسوں انتظار کرتے ہیں، انور جلال پوری کی شخصیت میں نمایاں خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے اخلاق سے برادران وطن کے دلوں کو جیت لیتے تھے، انہوں نے اردو شاعری کو ہندی رسم الخط یعنی دیوناگری کا پیرہن بھی عطا کیا، ان کی غزلوں کا مجموعہ 'جاگتی آنکھیں' اور 'اپنی دھرتی اپنے لوگ' دیوناگری رسم الخط میں ہیں۔ ان کو سب سے زیادہ شہرت گیتا کے منظوم ترجمہ 'نغمہ علم و عمل' سے ہندی دنیا میں حاصل ہوئی، اس کی زبان بہت میٹھی اور بہت سادہ ہے، گیتا کے پہلے باب کے شلوک نمبر 1 سے 4 کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

دھرت راشٹر آنکھوں سے محروم تھے
مگر یہ نہ سمجھو کہ معصوم تھے

انہیں بھی تھی خواہش کہ دنیا ہے کیا
اندھیرا ہے کیا اور اجالا ہے کیا

وہ ایک شخص سنجے پڑا جس کا نام
وہی ان سے آخر ہوا ہمکلام

اسے رب نے ایسی نظر بخش دی
کہ بن دیکھے ہر اک شئے دیکھ لی

ان اشعار کو دیوناگری پیرہن عطا کرنے کے بعد انہوں نے مشکل اردو الفاظ کے معنی بھی لکھ دیئے ہیں تاکہ ہندی قارئین ان کے کلام سے محظوظ ہو سکے، ان کے اس کارنامے پر 'پدم بھوشن' ڈاکٹر گوپال داس نیرج نے ان الفاظ میں ستائش کی ہے کہ ''یہ ترجمہ لوگوں کے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ لوگ اسے گنگناتے بھی ہیں۔ سب سے بڑی افادیت گیتا کی یہ ہے کہ وہ انور جلال پوری کے ترجمے کے بعد کتاب میں نہ ہو کر لوگوں کے زبان پر ہے، جسے وہ گاتے بھی ہیں اور گنگناتے بھی''۔ اس ترجمے سے وہ کس قدر متاثر ہوئے اس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں ''میں نے گیتا کے ہندی اور انگریزی زبانوں کے بھی کئی ترجمے پڑھے ہیں لیکن جیسا ترجمہ انور جلال پوری نے کیا ہے ویسا مجھے کہیں دوسری جگہ نہیں دیکھنے کو ملا'' ایک اردو ادیب اور شاعر کی ایک ہندو مقدس کتاب کا ترجمہ شہرت یافتہ ہندی ادیب و شاعر اس انداز سے کرتا ہے تو یہ انور جلال پوری ہی نہیں بلکہ اردو زبان کے تمام شیدائیوں کے لئے بہت بڑا اعزاز ہے۔

بارگاہ رسالت میں بھی انہوں نے خراج عقیدت کے پھول پیش کئے ہیں ان کے تین نعتیہ مجموعہ کلام شائع ہو چکے ہیں، جس میں 'ضرب لا الہ' 'بعد از خدا' 'حرف ابجد' ہیں۔ انہوں نے محسن انسانیت پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ مبارک پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا 'جمال محمدؐ' ہے۔ خلفائے راشدین کی سیرت سے امت مسلمہ کے ذہنوں کو منور کرنے کے لئے انہوں نے 'راہ رو سے رہنما تک' کتاب لکھی، ان کے مختلف مضامین کا مجموعہ 'روشنائی کے سفیر' کے نام سے داد و تحسین حاصل کر چکا ہے۔

زندگی کے نرم و گرم شب و روز گزارنے کے بعد جب شہرت ان کے در کی باندی ہوئی تو عزت و وقار کے عہدے ان کے پاس آ کر ان کی شمولیت سے سرخرو ہونے لگے، وہ مدرسہ بورڈ اتر پردیش لکھنؤ کے سابق چیئرمین، خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی لکھنؤ ایگزیکٹیو کمیٹی کے رکن، قانون اتھارٹی ضلع امبیڈکر نگر کے سابق رکن، حج کمیٹی اتر پردیش اور اردو اکیڈمی اتر پردیش کی ایگزیکٹیو کمیٹی کے سابق رکن کے علاوہ مرزا غالب انٹر کالج جلال پور امبیڈکر نگر اتر پردیش کے بانی، صدر اور منیجر کے عہدے پر فائز تھے۔ اب مشاعرے کی نظامتیں اور رسائل میں ان کے مضمون قاری کی نظر میں نہ آنے سے ان کی یاد تمام محبان اردو ادب کو بے چین کرتی رہے گی۔

مسجع جملوں کے فنکار

انور جلال پوری



احتشام افسر

نزد۔ایس.ٹی.اسکول، گورکھناتھ، گورکھپور

موبائل 7755812319

مشاعروں کے حوالے سے انور جلال پوری کی شناخت ایک ناظم کے طور پر تو ہوتی ہی ہے مگر وہ ایک اچھے شاعر بھی ہیں اور بہترین ترجمہ نگار بھی۔امبیڈکر نگر کے جلال پور قصبہ میں ۶ر جولائی ۱۹۴۷ کو ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم کرامتیہ مدرسہ دارالفیض سے حاصل کی۔جب کہ نریندر دیو کالج، جلال پور سے ثانوی تعلیم، اعظم گڑھ شبلی کالج سے گریجویشن اور پوسٹ گریجویش علی گڑھ سے کرنے کے بعد ۱۹ر جولائی ۱۹۷۳ء میں نریندر دیو انٹر کالج جلال پور میں انگریزی کے لیکچرر کے عہدے پر تقرری ہوگئی۔تعلیم وتعلم اور شعروشاعری کے اس بے تاج بادشاہ نے ۲ر جنوری ۲۰۱۸ کو داعی اجل کو لبیک کہا۔

انور جلال پوری تدرس وتدریس کے ساتھ ساتھ طالب علمی کے زمانے سے ہی شعروشاعری میں طبع آزمائی کررہے تھے۔جیسا کہ انور صاحب مشاعروں کی نظامت کے حوالے سے جانے جاتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک کہنہ مشق شاعر بھی تھے۔یہ الگ بات ہے کہ ان کی شاعری نظامت کے چادر کے نیچے دب کر رہ گئی۔لیکن اگر ان کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو اس طرح کے اشعار پڑھنے کو ملیں گے۔

جب بھی تنہائی ملی ہم اپنے غم پر رو لیے
محفلوں میں تو سدا ہنستے رہے گاتے رہے
عمر بھر زلف مسائل یونہی سلجھاتے رہے
دوسروں کے واسطے ہم خود کو الجھاتے رہے
حسن جب عشق سے منسوب نہیں ہوتا ہے
کوئی طالب کوئی مطلوب نہیں ہوتا ہے

کتنے عیسیٰ ہیں مگر اپنے محبت کے لیے
اب کہیں بھی کوئی مصلوب نہیں ہوتا ہے

شاعری میں ان کی خوشبو کی رشتہ داری، کھارے پانی کا سلسلہ، ضرب الٰہی، جمال محمد، بعد از خدا، حرف ابجد اور شہروں سے رہنما تک کے شعری مجموعے کے علاوہ جاگتی آنکھیں، پیار کی سوغات، ادب کے اکشر، چندہ اشعار، دیونا گری میں منظر عام پر آچکے ہیں۔علاوہ ازیں، مضامین کے مجموعے بھی شایع ہو چکے ہیں۔ویسے تو انہوں نے عم پارہ، عمر خیام کی رباعی، گیتا نجلی، اور بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ پیش کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ نہ صرف شاعر م، ناظم، مضمون نگار تک محدود ہیں بلکہ وہ ایک کامیاب اور بے حد کامیاب ترجمہ نگار بھی ہیں۔ترجمہ نگاری میں انہوں نے اپنی کامیابی کا لوہا اس وقت منوایا جب انہوں نے بھگوت گیتا کا اردو میں منظوم ترجمہ کر ڈالا۔دراصل منظوم ترجمہ نگاری کی یہ ایک کامیاب کتاب ثابت ہوئی۔اس کتاب کی کامیابی اور مقبولیت اتنی ہوئی کہ بعد از مرگ ملک کا باوقار اعزاز پدم شری ایوارڈ سے نوازے جانے کا اعلان انور جلال پوری کے نام کیا گیا۔جو انکے کامیاب مترجم ہونے کی دلیل ہے۔

گورکھپور میں ایک پروگرام کے دوران انہوں نے ترجمہ نگاری سے متعلق اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ پروفیسر محمود الٰہی صاحب نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ شعروشاعری کے علاوہ ترجمہ نگاری کی طرف بھی توجہ دیں اور ان کے اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے انور صاحب ترجمہ نگاری کے میدان کا انتخاب کیا چونکہ انور جلال پوری کو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔اس لیے انہیں اس میدان میں کوئی

دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا بلکہ شاعرانہ ذہن نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ نتیجے کے طور پر غم پارہ، گیتا، گیتا نجلی وغیرہ جیسے ایک کے بعد ایک منظوم ترجمے سامنے آتے گئے۔

دراصل انور جلال پوری کی اصل شناخت ایک ناظم کے طور پر ہوتی ہے۔ نظامت کے میدان میں انور صاحب نے اس وقت قدم رکھا جب میں نظامت کے میدان ملک میں عمر قریشی اور ملک زادہ منظور احمد کا طوطی بول رہا تھا۔ یہ دونوں حضرات نظامت کے شہسوار تھے۔ یہ مشاعرے کو وقت سے قبل ختم کرانے اور وقت کے بعد تک مشاعرہ جاری رکھنے کا ہنر بخوبی جانتے تھے۔ یہ بھی جانتے تھے کہ عوام اب کیا چاہتی ہے۔عوام کو اپنے سحر بیانی سے مسحور کرنے کا فن بھی انہیں خوب آتا تھا۔ملک زادہ منظور احمد اور عمر قریشی کی نظامت کا جادو انور جلال پوری پر اس طرح اثر انداز ہوا کہ وہ بھی ان کی نظامت سے متاثر ہو کر نظامت کے میدان میں کود پڑے۔ وہ خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں ''میں ملک زادہ اور عمر قریشی کا سنگم ہوں اور انہیں امتیازات سے میری انفرادیت ابھرتی ہے۔'' جبکہ عمر قریشی کو وہ میرے ذہن کا پہلا ساحر کہتے ہیں۔

بہر حال انور جلال پوری کے اندر نظامت کے وہ تمام اوصاف موجود تھ جو ایک کامیاب ناظم میں ہونا چاہئے برمحل اشعار اور حاضر جوابی نظامت کا ایک اہم حصہ ہوتا ہے اور یہ دونوں اوصاف انور میں موجود تھے۔مشاعرہ کس رخ پر جا رہا ہے اور کس جانب لے جانا ہے اس ہنر سے بخوبی واقف تھے۔شعراء اور سامعین کے درمیان تال میل قایم رکھنا ۔سامعین کے رخ کے مطابق شعراء کو پڑھوانا اور مشاعرے کے اختتام تک عوام کو رکھنے پر مجبور کرنا اور ان کی نظامت کا ایک فن تھا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مجمع سے اٹھے طوفان کے رخ کو موڑنے کا ہنر انہیں بخو بی آتا تھا مشاعروں کی نظامت اور ان کی زبان سے سجے بجائے جملے سامعین کو مبہوط کر دیتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بہت جلد ملک زادہ منظور احمد اور عمر قریشی کی صف میں انور جلال پوری کا نام بھی شامل ہو گیا اور اگر یہ کہا جائے کہ انور جلال پوری نے اپنی پوری زندگی مشاعرے کے لیے وقف کر دی تھی تو یہ غلط نہ ہوگا۔اس طرح بلا تامل یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انور جلال پوری ایک بہترین ناظم، خطیب، ترجمہ نگار، مضمون نگار اور شاعر کے ساتھ ساتھ مسجع جملوں کے بھی شہسوار تھے۔ میں کچھ چنندہ اشعار ملاحظ فرمائیں۔

وہ شخص میرا ساتھ نہ دے پائے گا جس کا
دل صاف نہیں ذہن کشادہ نہیں

کیا بتاؤں کتنی ظالم ہوتی ہے جذبات کی آنچ
ہوش بھی ٹھنڈے کر دیتی ہے اکثر احساسات کی آنچ

◆◆◆

زنجیر و طوق یا رسن و دار کچھ تو ہو
اس زندگی کی قید کا معیار کچھ تو ہو

میں سہل راستوں کا مسافر نہ بن سکا
میرا سفر وہی ہے جو دشوار کچھ تو ہو

ایسا بھی کیا کہ کوئی فرشتوں سے جا ملے
انسان ہے وہی جو گنہگار کچھ تو ہو

◆◆◆

حادثے ان کے قریب آکر پلٹ جاتے رہے
اپنی چادر دیکھ کر جو پاؤں پھیلا رہے

◆◆◆

خواہش مجھے جینے کی زیادہ بھی نہیں
ویسے ابھی مرنے کا ارادہ بھی نہیں

◆◆◆

برے وقتوں میں تم مجھ سے نہ کوئی رابطہ رکھنا
میں گھر کو چھوڑنے والا ہوں اپنا جی کڑا رکھنا

◆◆◆

تم پیار کی سوغات لیے گھر سے تو نکلو
رستے میں تمہیں کوئی بھ دشمن نہ ملے گا

◆◆◆



سماج کا سبق پڑھانے والا قلمکار

انور جلالپوری

محمد غفران نسیم

219/27۔ پاٹانالا لکھنؤ

موبائل نمبر 9450401073

دنیا کے مشہور ادیب، شاعر، شاعر وغیر ہقلمکار، ایک سے بڑھ کر ایک ادبی تخلیق سے قارئین کی ادبی ضروریات کو پورا کرتے رہتے ہے۔ جس سے انہیں بھی شہرت اور احترام حاصل ہوتا ہے لیکن ایک کامیاب قلمکار وہ ہوتا ہے جس کی ادبی تخلیق اس دنیا سے گزر جانے کے بعد بھی اس کے کام آتی رہیں اور دنیا والوں کو بھی اس کا فائدہ ہوتا رہے۔ انور جلالپوری ایک ایسے ہیقلمکار ہیں۔ جن کی ادبی تخلیقات جہاں ادبی ورثہ ہیں وہیں مذہبی طور پر بھی انہیں یاد رکھا جائے گا۔ ویسے تو ان کی شہرت ایک ناظم (اناؤنسر) کے طور پر ہوتی رہی۔ اسی حوالے سے انہوں نے دنیا کے مختلف ممالک کا سفر کیا۔ لیکن ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ ہشت پہل شخصیت کے امیر تھے۔ انور جلالپوری کا مکمل نام انوار احمد تھا۔ لیکن پوری دنیا میں وہ مشہور انور جلالپوری کے نام سے ہوئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کرنے والے انور جلالپوری کو ایک سے بڑھ بڑھ ایک روزگار کے موقع ملتے، جیسی کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارغین کی تاریخ ہے لیکن انہوں نے اپنی عملی زندگی اور خدمت کے لیے اپنے وطن کو ہی کو فوقیت دی اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد کی خدمت کے لئے اپنے وطن یعنی جلالپور کو ترجیح اور وہاں درس و تدریس کی خدمت سے وابستہ ہو گئے۔ وہ انگیریزی کے استاد تھے۔ اردو کے شاعر تھے۔ سنسکرت، عربی، فارسی کے عالم تھے۔ ہندی اور اودھی کے پریمی تھے۔

یہ باتیں میں نے ایسے ہی نہیں لکھ دیں۔ خود انور جلالپوری کی تخلیقات سے یہ ثابت ہیں۔ انہوں نے گیتا کا اردو میں ترجمہ کر کے یہ ثابت کیا ہے وہ انہیں سنسکرت اور ہندی کا کتنا علم تھا۔ جدید دور میں جہاں گیتا کے شلوک کو سمجھنے والے مشکل سے ملتے ہیں وہیں انور جلالپوری نے پوری گیتا کو نہ صرف سمجھا بلکہ اسکو اردو شاعری میں ترجمہ کر کے اتنا بڑا ادبی، مذہبی، خیر سگالی اور گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دینے کا کام کیا ہے جسے صدیوں تک یاد رکھا جائے گا۔ ایسے وقت جب معاشرے میں نفرت پھیل رہی ہو، لوگ ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے ہوں تب انور جلالپوری نے گیتا جیسی اہم مذہبی کتاب کا اردو شاعری میں ترجمہ کر کے اس بڑھتی ہوئی خلیج کو پاٹنے کا بڑا کارنامہ انجام دیا جو وقت کی ضرورت ہے۔ مذہبی کتاب کے اس ترجمہ سے انور جلالپوری کی علمی صلاحیت کا اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے۔

انہوں نے سنسکرت کے شلوک کو پڑھا سمجھا، پھر اسے اردو میں ترجمہ کیا اور ترجمہ کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کے سانچے میں ڈھالا۔ کسی ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا ایک فن ہے اور اس فن کو اردو شاعری کے اصولوں کے مطابق اسی سانچے میں ڈھالنا مہارت کی دلیل ہے۔ انور جلالپوری نے خود کہا کہ جب انہوں نے گیتا کے شلوک پڑھے تو ایسا لگا کہ یہ تو وہی پیغام ہیں جو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے ملتا ہے۔ اور جس کی آج کے معاشرے کو زیادہ ضرورت ہے۔ اور انہوں نے گیتا کا اردو میں ترجمہ کرنے کا بیڑا اٹھا کر اسے انجام تک پہنچا دیا۔ اس طرح گیتا کے شلوک اور پیغام کو ان لوگوں کے لئے آسان بنا دیا جو گیتا کو پڑھ نہیں سکتے، پڑھ سکتے ہے تو سمجھ نہیں سکتے۔ انور صاحب کا یہ ادبی کام اتنا اہم ہے کہ اگر اسے ادبی دنیا چھپائے یا بھلانا چاہے بھی تو

ایسا نہیں ہو سکے گا۔ کیونکہ ہندی اور اردو میں کسی نہ کسی طرح سے ان کی یہ تحریریں لوگوں کے سامنے آتی رہے گی۔ جب بھی گیتا اور شاعری کی بات ہوگی انور جلالپوری کی خدمات کو یاد کیا جائے گا۔

گیتا کے ترجمہ کی تقریب رسم اجرا کے موقع پر وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو (اب سابق وزیر اعلیٰ) کی موجودگی میں جب انور صاحب گیتا کا شلوک پڑھتے تو ایسا لگتا کہ کوئی سنسکرت کا ودوان بول رہا ہے اور جب اسی شلوک کا اردو ترجمہ پیش کرتے تو ایسا لگتا کہ اردو، عربی، فارسی اور اودھی کا عالم عوام کو ان کی ہی زبان میں گیتا کی تعلیم دے رہا ہو۔

اسی طرح انور جلالپوری نے اردو شاعری میں حمد (اللہ کی تعریف) نعت (پیغمبر اسلام کی شان میں شاعری) منقبت خلفائے راشدین (پیغمبر اسلام کے جانشین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ، امیر مومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ، امیر مومنین حضرت عثمان رضی اللہ اور امیر مومنین حضرت علی رضی اللہ) کی شان میں جو کلام لکھا ہے وہ یقینی طور پر دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی انور جلالپوری کے کام آ رہا ہو گا! اور بعد میں آنے والی نسلوں کی بھی رہنمائی کرتا رہے گا۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ نعت نبی لکھنا شوق عقیدت، اظہار عقیدت ہے اور مدح صحابہؓ لکھنا فرمائش نبی صلعم کی تکمیل ہے۔

انور جلالپوری نے مشاعروں کی دنیا میں اپنی شاعری کے ساتھ ساتھ اپنی نظامت سے بھی خوب شہرت حاصل کی۔ اس کے لئے وہ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کو اپنا استاد تسلیم کرتے تھے۔ وہ نظامت کے فن میں بھی ماہر تھے اور کیسا ہی ماحول ہو، وہ اسٹیج اور سامعین دونوں کو سنبھالنا اچھی طرح سے جانتے تھے۔ یوں تو ان کی نظامت کے حوالے سے درجنوں قصے مشہور ہیں۔ یہاں پر ایک قصہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اودھ کے علاقے میں ایک مشاعرہ کی نظامت انور جلالپوری کر رہے تھے۔ اس مشاعرہ کی صدارت سابق مرکزی وزیر محترمہ محسنہ قدوائی کر رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے صدارتی خطاب میں خواتین کے لئے پنڈال کے آخری حصہ میں بندوست کئے جانے پر سوال اٹھایا۔ اس سے قبل کہ مہتمم مشاعرہ کوئی صفائی پیش کرتے، انور جلالپوری نے انہیں بتایا کہ خواتین پہلے ہی سے ہمارے سروں پر مسلط ہیں ان کے لئے مشاعرہ پنڈال سے ملحق بڑے مکان کی چھت پر بیٹھنے کا پہلے ہی سے بندوبست۔ اس طرح کی حاضر جوابی ان کی شخصیت میں چار چاند لگا دیتی تھی۔

شاعری اور نظامت کے ساتھ ساتھ انور صاحب مختلف سرکاری اداروں سے بھی منسلک رہے۔ وہ اتر پردیش مدرسہ تعلیم بورڈ کے چیئرمین ہوئے۔ اس سے پہلے مدرسہ بورڈ کے دو چیئرمینوں کی اہلیت کو عدالت میں چیلنج کیا گیا تھا اور عدالت نے انہیں نااہل ٹھہرایا۔ جس کے سبب ان چیئرمینوں کو مدرسہ بورڈ سے رخصت ہونا پڑا، لیکن انور جلالپوری کی قابلیت اور مختلف زبانوں کے جاننے والا ہونے کی وجہ سے انہیں مدرسہ بورڈ میں کام کرنے کا خوب موقع ملا۔ وہاں بھی انہوں نے سرکاری عہدہ کا کوئی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ بورڈ کے کاموں کو تیز کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے نصاب کو بھی اپ ڈیٹ کرنے کی سمت میں قدم اٹھایا۔ انہوں نے یونیورسٹی کی سطح پر مدرسہ بورڈ کے امتحان کو منظور کرانے کی بھرپور کوشش کی۔ وہ لکھنؤ میں قائم کانشی رام (اب خواجہ معین الدین چشتی) اردو، عربی، فارسی یونیورسٹی کی مجلس عاملہ کے رکن بھی نامزد ہوئے اور انہوں نے مدرسہ بورڈ کے چیئرمین کے طور پر مدرسہ بورڈ کے کامل اور فاضل کے امتحانات کو یونیورسٹی کی گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن (ماسٹر ڈگری) کی سطح پر منظور کرنے کے لئے تجویز منظور کر کے اردو عربی یونیورسٹی کو منظوری کے لیے بھیجی۔ یونیورسٹی میں اس پر غور بھی ہوا نیز اس کو منظور کرنے پر اتفاق رائے بھی ہوا۔ لیکن اس سے قبل ریاست میں سیاسی تبدیلی ہوگئی اور اقتدار منتقل ہو جانے کے سبب وہ تجاویز عملی طور پر نافذ نہیں ہو سکیں۔

انور صاحب اچھی طرح نثر بھی لکھنے میں ماہر تھے۔ مختلف شخصیات پر ان کے مضامین اس کا ثبوت ہیں۔ مشاعرے کا اسٹیج ہو، فلم کی اسکرین ہو، سرکاری عہدہ ہو یا تعلیم کا میدان۔ ہر شعبہ میں انور صاحب کی خدمات کو کبھی بھلایا نہیں جا سکے گا بلکہ انہیں زریں حروف سے لکھا جائے تو کم ہے۔ ہندوستان کی صدیوں برس قدیم گنگا-جمنی تہذیب کو فروغ دینے، اتحاد اور بھائی چارہ کو فروغ دینا ان کی ترجیح تھی۔ جو ان کے اشعار اور زندگی میں بھی صاف نظر آتی ہے۔ کچھ اشعار

ملاحظہ فرمائیں۔

ہم کاشی کعبہ کے راہی ہم کیا جانے جھگڑا بابا !
اپنے دل میں سب کی الفت، اپنا سب سے رشتہ بابا
ہرانسان میں،نورخدا ہے،ساری کتابوں میں لکھا ہے
وید ہو یا انجیل مقدس ہو قرآن کہ گیتا بابا

مذکورہ اشعار میں انوار صاحب نے کعبہ اورکاشی کی مذہبی وتاریخی اہمیت کے ساتھ ساتھ تمام انسانوں، تمام مذاہب اور مذہبی کتابوں کو بیان کرکے ان کی ضرورت اورافادیت پر بھرپورطریقے سے روشنی ڈالی ہے۔

اسی طرح انورصاحب معاشرے کے رجحان پر لکھتے ہیں

میں چراغ ہوں، نہ دیوار ہے نہ، چھت، میری
ہوائیں پھر بھی کرتی ہیں مخالفت میری

انورصاحب نے انسان کی مجبوری،مصلحت اورسماجی بندشوں پرروشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ

آدمی دنیا میں اچھا یا برا کوئی نہیں
سبھی کی اپنی مصلحت ہے بے وفا کوئی نہیں!

ہندوستان کی اہمیت اورخصوصیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

انیکتا میں جہاں ایکتا ملی انور
ہم اس دیار کو ہندوستان کہنے لگے

انورصحاب کا موقف تھا کہ دنیا میں ہرشخص کو ایک خاصیت حاصل ہےاوراس خاصیت نہ توکوئی چھین سکتا ہےاورنہ ہی اسے تبدیل کرسکتا ہے۔وہ تاج محل کے بارے میں لکھتے ہیں

تم سے ملتی جلتی آواز کہاں سے لاؤں گا
تاج محل بن جائے اگر ممتاز کہاں سے لاآؤں گا

انورصاحب نے نفرت کی آگ بجھانے اورمحبت کے پیغام و ماحول بنانے کے لیے کہا ۔

بہت برباد کر ڈالا ہے، ہم کو نفرت نے
اٹھے لفظ محبت لکھ کے سجدہ کرلیاجائے

انورجلالپوری صاحب کا ادبی وقلمی تعاون فلم اورٹی وی کی دنیا میں بھی رہا ہے۔1996 میں انورجلالپوری نے اس وقت کے مشہور ٹی وی سیریل اورڈیلی سوپ'اکبرمہان ' کے لئے نغمے اور مقالمے لکھے۔ اس کے علاوہ نصیرالدین شاہ، ارشدوارثی، مادھوری دکشت اور ہما قریشی کی اداکاری والی فلم ''ڈیڑھ عشقیہ''میں مشاعرہ کہ نظامت اور شاعر کے بطورادا کاری بھی کی۔

انورصاحب نے شروع سے تعلیم کی اہمیت پرزور دیا۔اس کی زندہ مثال ان کا قائم کردہ کالج ہے ۔ ابتدائی مرحلے میں، انورصاحب 1969 میں مرزاغالب کے نام پرایک سکول قائم کیا تھا ۔ وہ اسکول آج ایک انٹرکالج کے طور پر تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے، اورشہر کے ہزاروں بچے وہاں تعلیم حاصل کررہے ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک طالب علم کے طور پر،علی گڑھ سے ان کی وابستگی قدرتی تھی ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائزایسوسی ایشن لکھنؤ شاخ کی سالانہ تقریب میں ایسوسی ایشن نے انور صاحب کواستقبالیہ خطبہ پیش کرنے کے لیے مدعوکیا۔17اکتوبر2017 کو،انہوں نے سرسید کی یاد میں منعقد'سرسیڈے'پر ان کا خطاب آخری تقریرثابت ہوا۔

ہمیشہ بڑوں کا احترام اورچھوٹوں سے محبت کرنے والے انور صاحب کواس عالمی حقیقت کا مکمل علم تھا کہ انسان کوایک دن اس فانی دنیا کو چھوڑ کر جانا ہے اور جانے والے کا دکھ بھی ہوتا ہے اسی لیے انہوں نے اپنے جانے سے پہلے ہی اپنے چاہنے والوں کونصیحت کرتیہ ہوئے لکھا تھا

میں جارہا ہوں مرا انتظار مت کرنا
میرے لیے کبھی دل کو سوگوار مت کرنا

ان سطروں کے خالق آخرکار 2 جنوری،2018 کواپنے چاہنے والوں کوروتا چھوڑ کراس فانی دنیا سے دائمی دنیا کوکوچ کرگئے۔ اب وہ واپس تونہیں آئیں گےلیکن ان کی تخلیقات، ان کی تحریریں صدیوں تک آنے والوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوں گی۔



میں جارہا ہوں مرا انتظار مت کرنا

عظمت علی

ریسرچ اسکالر، المصطفیٰ یونیورسٹی، تہران

ای میل:Rascov205@gmail.com

زندگی ایک سفر ہے، انسان مسافر اور دنیا مسافر خانہ۔ اس عالم فانی میں بسنے والی تمام مخلوقات کو فنا ہونا ہے۔ یہ سانسیں نہیں بلکہ قدم ہیں اپنی منزل مطلوب کی جانب۔ اور اٹھنے والا ہر قدم خاتمہ کی دور پر جا کر تمام ہوتا ہے۔

عقل مند مسافر کسی پل بھی اپنے فرائض سے غافل نہیں ہوتا اور خاص طور سے اس چند روزہ زوال آمادحیات کی بھول بھلیا میں خود کو گم نہیں کرتا بلکہ اس کی نگاہیں ہمیشہ روشن مستقبل پر رہتیں ہیں۔

رواں سال کی آمد پر خوب خوشیاں منائی گئیں۔ لیکن شاید سر زمین ہند کو اکیسویں صدی کا سن بلوغ راس نہ آیا اور نہ جانے اس میں کون سا فرط درد نہاں تھا کہ مسرت کے لمحات ابھی ختم نہیں ہوئے تھے کہ یکا یک اردو فضا میں غم کی لہر دوڑ گئی اور سب کو مغموم کر گئی۔ اردو ادب کو شدید صدمہ پہنچا اور دبستان اردو ماتم کدہ میں تبدیل ہو گیا اور اخباروں کی سرخیاں انور جلالپوری کے فقدان میں رخ سرخ سی نظر آئیں۔

انور جلالپوری ۶ رجولائی ۱۹۴۷ میں اتر پردیش کے قصبہ جلالپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کرامتیہ مدرسہ دارالفیض سے حاصل کی۔ شہر اعظم گڑھ شبلی کالج سے گریجویشن کیا۔ اس کے بعد انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرف رخت سفر باندھا۔ وہاں سے انہوں نے انگلش زبان میں پوسٹ گریجویشن کیا۔ اسی طرح اودھ یونیورسٹی فیض آباد سے ایم.اے. اردو کی تعلیم مکمل کی۔ ۱۹۶۰ کی بات ہے کہ جب وہ نریندیو انٹر کالج (جلالپور) کے نویں جماعت میں زیر تعلیم تھے تو اسی زمانہ سے وہ شاعری کے میدان میں اتر پڑے۔ ۱۹۶۲ میں پہلی دفعہ ان کو ایک ادبی نشست کی نظامت کا موقع نصیب ہوا گویا اسی دور سے ان کی نظامت کا آغاز ہو چلا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان کی نظامت ان کے شعر و شاعری پر غالب آ گئی اور کافی حد تک ان کے شعری سفر کی رفتار میں سستی نظر آنے لگی۔

جس وقت انہوں نے دنیائے نظامت میں قدم رکھا، اس وقت پروفیسر ملک زادہ منظور احمد اور عمر قریشی جیسے سحر البیان ناظم مشاعرہ کا طوطی بول رہا تھا اور انہیں نظامت کے اس کے نشیب و فراز پر مکمل احاطہ تھا۔ اور اس بات کی مہارت تھی کہ مشاعرے کو کیسے مقبول بنایا جاتا ہے ان کو عوام الناس کے ذہنوں پر مکمل گرفت حاصل تھی اور بخوبی جانتے تھے کہ اس خفتہ مجمع کو دوبارہ کیسے جگایا جا سکتا ہے۔

انور جلالپوری نے انہیں دو ماہر ناظموں سے بہت کچھ سیکھا۔ وہ خود اس بات کے معترف بھی تھے کہ ''میں ملک زادہ اور عمر قریشی کا سنگم ہوں اور انہیں امتیازات سے میری انفرادیت ابھرتی ہے۔''

انہوں نے ان دو ہستیوں سے فن نظامت سیکھی اور وہ بھی بہترین انداز میں! وہ مشاعروں کی زینت، رونق محفل اور میدان نظامت میں فرد فرید کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے پاس یہ ہنر تھا کہ کب اور کیوں کر مشاعرہ کا رخ بدلنا چاہئے۔ وہ سامعین کے شور و غوغا پر اپنے جادوئی بیان سے سکوت قائم کرنے پر ہمیشہ کامیاب و کامران رہتے تھے۔ لفظوں کا انتخاب، کلمات سنگم، جملوں کی کشش، لہجے کا اتار چڑھاؤ اور اشعار کی ادائیگی یہ تمام ہنر اس حسن کمال سے ادا کرتے کہ ان کی مسحور آمیز آواز سامعین پر اپنا جادو جگا دیتی اور پورے مجمع پر سکوت پیہم چھا جاتا۔ ان کی نظامت اتنی پر کشش تھی کہ لوگ کوسوں سے کھینچتے چلے آتے۔ بولتے ایسا تھے جیسے باتوں سے پھول جھڑتے ہوں اور آواز کانوں میں رس گھولتی ہو۔

وہ ملک و بیرون ملک میں مختلف مقامات پر نظامت کے فرائض انجام دیتے اور اس کمال سے نظامت کرتے کہ مشاعرہ لوٹ لیتے۔ مشہور تو یہی کہ وہ ایک شیریں زبان اور رطب اللسان ناظم مشاعرہ تھے۔ بات تو سو فیصدی سچ ہے لیکن اس کے سوا بھی کچھ اور بھی حقیقتیں ہیں جو ان سے منسلک ہیں وہ اچھے شاعر، نثر نگار اور مترجم بھی تھے۔

انور جلالپوری نے متعدد شعری آثار چھوڑے ہیں لیکن ہندو مذہب کی مقدس کتاب 'بھگوت گیتا' کا منظوم ترجمہ اپنی مثال آپ ہے۔ انہوں نے اسے قدر سہل اور سلیس زبان میں ترجمہ کیا ہے کہ ہر کوئی بھی آسانی سے اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔ ان کی اس منظوم کاوش کو ''اردو شاعری میں گیتا'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان کا یہ عظیم کارنامہ ہے۔ بہر حال ان کی عظمت کو دو بالا کیا ہے اور رہتی دنیا کو درس اتحاد و امن دیا ہے۔

انہوں نے رابندر ناتھ ٹیگور کی طویل بنگلہ زبانی نظم ''گیتا نجلی'' کا بھی منظوم ترجمہ کیا ہے اور انہوں نے رباعیات خیام کے نام سے عمر خیام کے رباعیوں کا بھی منظوم ترجمہ کیا ہے۔ ان کی یہ گرانقدر کاوشیں ان کی روشن فکری کا بین ثبوت ہیں۔ جہاں ان کی یہ ساری اردو خدمات ہیں وہیں ان کی اسلامی اردو قلمی آثار بھی موجود ہیں۔ انہوں نے قرآن مجید کے تیسویں پارے کا بھی منظوم ترجمہ کیا ہے جسے انہوں نے ''توشہ آخرت'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس کے ما سوا انہوں نے متعدد کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ ان کی تخلیقات میں پیار کی سوغات، خوشبو کی رشتہ داری، جاگتی آنکھیں، کھارے پانیوں کا سلسلہ، ادب کے اکثر، روشنائی کے سفیر، اپنی دھرتی اپنے لوگ، قلم کا مسافر، ضرب لا الہ، جمال محمد بعد از خدا، حرف ابجد، راہبر سے راہنما تک (نعتیہ مجموعہ) سفیران ادب (مجموعہ مضامین) اور چند واشعار (غزلیں اور نظمیں) قابل ذکر ہیں۔

حالیہ سال ۲؍جنوری ۲۰۱۸ء، بروز منگل، صبح دس بجے چار روز وینٹی لیٹر پر موت و حیات سے دست و پنجہ نرم کرتے رہے اور آخرش برین ہیمریج کے باعث شہر لکھنؤ کے میڈیکل کالج میں ۷۱؍برس کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ جب تلک دہر میں آثار قلم زندہ ہیں، ان کا نام بھی باحیات رہے گا۔



قطعات

بیادِ انورؔ جلال پوری

ڈاکٹر مخمورؔ کاکوروی

۶۸۔ چودھری محلّہ، کاکوری لکھنؤ 226101

Mob.9450097929



حضرتِ انورؔ فقط ناظم نہ تھے
شعر گوئی میں بھی رکھتے تھے کمال
حمد و نعت و منقبت، نظم و غزل
اُن کی تخلیقات سب ہیں لا زوال



خوش ہوں یا غمگین ہوں ہر حال میں
زندگی بھر شکرِ رب کرتے رہے
دارِ فانی میں رہے جس وقت تک
خدمتِ اردو ادب کرتے رہے



جہد و عمل کا پیکر انورؔ جلال پوری
شعر و ادب کا محور انورؔ جلال پوری
مخمورؔ معترف ہیں سب اُن کی عظمتوں کے
دانشور و سخنور انورؔ جلال پوری





انور جلالپوری
ادب کی مجسم تصویر

سلمان عبدالصمد
ریسرچ اسکالر۔ جے. این. یو.، دہلی
موبائل نمبر09810318692

انور جلال پوری ایک ایسی شخصیت کا نام ہے، جن کا ذکر ہوتے ہی نوجوان نسل میں بالعموم ایک ناظم مشاعرہ یا ایک معروف شاعر کی تصویر ابھر آتی ہے، بالفاظ دیگر ان کے ان دونوں اوصاف کا ذکر ہی زبان زد خاص وعام ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ نثری سمندر کے بھی شناور ہیں اور خطیبانہ صلاحیت وبصیرت فطرت سے پائی ہے۔ جہاں انہوں نے شاعری کی مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی وہیں بحیثیت ایک اچھے اور سلجھے نثر نگار ان کے قلم گہر بار سے متعدد تنقیدی، شخصی اور تاثراتی مضامین منصۂ شہود پر آئے۔ یکساں طور پر حمد، نعت، نظم، قصیدہ، مرثیہ اور قطعہ وغیرہ اصناف سخن ان کی دلچسپی کی مرکز رہیں۔ شاعری کے حوالہ سے خمار بارہ بنکوی، بشیر بدر، راحت اندوری اور منور رانا پر ان کے پر مغز مضامین انتہائی دلچسپ اور نغمگی آمیز ہیں۔ اسی طرح شخصی مضامین کی فہرست میں چند قابل ذکر مضامین مظفر حسین کچھوچھوی، مولانا ضمیر احمد اور ڈی این آر یہ پر انتہائی سلیس اور معلومات افزا ہیں اور اس پر مستزاد ان کے عناوین بھی بڑے دلکش اور دلآویز ہیں۔

اسلم الہ آبادی یوں رقمطراز ہیں:

انور جلال پوری ایک شاعر کے ساتھ ساتھ ایک اچھے نثر نگار بھی ہیں، ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال کے حوالہ سے انور کے مضامین بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔.....وہ فطری طور پر ایک خطیب ہیں، خطیبانہ صلاحیت ان کو خدا کی طرف سے ودیعت ہے۔ ان کی افسانوی ورومانی نثر ایک تاثراتی فضا ہموار کرتی ہے، ان کا مکالماتی لہجہ قاری کو دعوتِ فکر دیتا ہے۔

انور جلالپوری کی شعری ونثری کئی ایک تصنیفات زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں، جن کا حلقہ ادب میں بڑی قدر و قیمت ہے اور گلدستۂ داد وتحسین سے بھی نوازی گئیں۔ شعری تخلیقات میں ''کھارے پانیوں کا سلسلہ''، ''خوشیوں کی رشتہ داری'' اور حمدیہ اور نعتیہ مجموعوں میں ''ضربِ لا الہ''، ''حرف ابجد'' اور ''جمال محمد'' قابل ذکر ہیں، بالعموم ادبی اور بالخصوص مذہبی حلقے میں ان حمدیہ اور نعتیہ مجموعوں کی بڑی عقیدتمندانہ پذیرائی ہوئی۔ نثری تخلیق میں ''روشنائی کے سفیر'' بھی انتہائی اہم ہے۔ حلفائے راشدین کے تعلق سے ان کے متعدد طویل نظمیں بھی ہیں، جو زیر ترتیب ہیں اور ادبی وتنقیدی مضامین کا گراں قدر سرمایہ محفوظ ہے، افادۂ عام کے لئے جنہیں منظر عام پر لانا ضروری ہے۔

انور جلال پوری کی ابتدائی تعلیم مقامی مدرسہ اسلامیہ میں ہوئی، 1962-64 میں انہوں نے بالترتیب نریندر دیو کالج جلالپور سے ہائی اسکول اور انٹر پاس کیا، 1965 میں اعلی حصول تعلیم کی غرض سے شبلی کالج اعظم گڈھ میں داخلہ لیا۔ چونکہ انور نے خطابت کا دلکش انداز اور سحر بیانی فطرت سے پائی تھی، اس لئے کالج کے غنچۂ خطابت ونظم خوانی کے مقابلہ آرائی میں بڑی شہرت کمائی، ان کی تقریر کی اتنی پذیرائی ہوئی کہ یونین کے الیکشن میں سکریٹری منتخب ہوئے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے زمانۂ طالب علمی میں ہر طرح ان کی شخصیت کی نشو ونما ہوئی۔

اب آئیں! ذرا انور جلال پوری کی شاعرانہ کیاریوں سے چند دلکش پھول چن لیں اور مشام جاں کو معطر کریں، ان کی حمدیہ اور نعتیہ شاعری جس کی پذیرائی حلقہ ادب ومذہب میں خوب ہوئی، میں چند اشعار کچھ یوں ہیں:

زبانِ ناقص سے کیا بیاں ہو خدائے برتر کمال تیرا
نگاہ و دل میں سما رہا ہے جلا ل تیرا ، جمال تیرا

تیرے ہی اک لفظ کن کے صدقہ میں بن گئی کائنات ساری
ازل سے یوم النشور کی شام تک ہے تیرا ہی فیض جاری

◆◆◆

حسین تر ہے، عظیم تر ہے، یہ رتبہ لازوال تیرا

◆◆◆

حیات تجھ سے، ممات تجھ سے، حقیقت کائنات تجھ سے
تمام سمتوں کی بات تجھ سے، فسانہ شش جہات تجھ سے

◆◆◆

تیرا ہی ذکر بلند کرنا جہاں میں شاعر کی آبرو ہے
یہی تو انور کی ہے تمنا، یہی تو انور کی آرزو ہے

◆◆◆

تو اس سے پہلے ہی موت دے دے نہ دل میں ہو خیال تیرا

مذکورہ بالا اشعار میں عاجزی وانکساری بلکہ فروتنی کی ایسی جھلک کہ انسانی زبانِ ناقص سے خدا کی شان کبریائی وتعلیٰ کی ثناخوانی سے قاصر ہے، نگاہ ودل میں خدا کا جمال وجلال سمارہا ہے، انور خدا کی حمد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ازل سے تیرا فیض جاری ہے اور تاصبحِ قیامت جاری رہے گا، تیری خلاقیت کی مہریں چاردانگ عالم پر ثبت ہیں، تجھ سے ہی موت وزیست اور حقیقتِ کائنات مربوط ہے اور شاعر کی آبرو خالق کی ثناخوانی، اس کی شان کبریائی اور ہمہ دم اس کے گن گانے ہی میں ہے، اس لئے ان کی آرزو وتمنا کہ پل پل گزرے تو خدا کی تعریف وتوصیف یعنی حمد میں۔

انور کے یہاں رسمی حمد یہ اشعار نہیں بلکہ ہر ایک شعر عشق خدا سے معمور ہے اور بندگی کے احساس سے لبریز بھی، انسان کی کم مائیگی وبے بضاعتی پر محیط ہے اور خدا کے فضل وکرم کی امید سے سرشار بھی، یہی وجہ ہے کہ دربارِ خدا میں مومن کی تاثیر وقوت اور جرأت وشجاعت کے لئے دست سوال دراز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یارب دلِ مومن کی آہوں میں اثر دے دے
بازوئے مسلماں کو جبرئیل کے پردے دے

◆◆◆

اسلاف کی جرأت کا ہورگ میں لہوجاری
مرنے کے لئے ہم بھی کرنے لگیں تیاری

◆◆◆

اس جامِ شہادت کے پینے کا ہنردے دے

◆◆◆

صدیقؓ کی عظمت کے پرچم ہوں مکانوں پر
فاروقؓ کی مدحت کے نغمے ہوں زبانوں پر

◆◆◆ ◆◆◆

عثمانؓ کا دل دے دے، حیدرؓ کا جگر دے دے

ان اشعار میں تضمینات کی دلکشی اپنے جلوے بکھیر رہی ہے تو خلفائے راشدین سے حقیقی لگاؤ اور گہری عقیدت کا بھی اظہار ہورہا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور خدا کی ابدیت پر انور کچھ اس طرح نغمہ سنج ہیں:

نہ یہ دن نہ یہ رات باقی رہے گی
بس اللہ کی ذات باقی رہے گی
نہ گردش میں صدیوں زمانہ رہے گا
سدا تو کسی کا نہ سکہ چلے گا
ہمیشہ نہ کوئی جنازہ اٹھے گا
نہ خوشبو کی برسات باقی رہے گی
بس اللہ کی ذات باقی رہے گی

حمد سے زیادہ نعت کے سمندر کی شناوری نازک کام ہے، اس میدان میں قدم پھونک پھونک کر رکھنا ہوتا ہے اور قوت بیان کی ڈور کو لگام کسنے کے بعد ہی کچھ کہا جاتا ہے، مبادا فرطِ عقیدت اور جوش میں بشریت کا سرا الوہیت سے نہ جاملے، اسی احساس کے ساتھ عرفی نے کہا نعت کہنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مرادف ہے۔ انور کے اندر عشق نبی کوٹ کوٹ کر بھری ہے، وفورِ محبت سے ان کا انگ انگ بھرا ہے، چنانچہ وہ محتاط انداز میں صنف نعت ومنقبت پر طبع آزمائی کرتے ہیں، سیرت رسول اکرم ﷺ پر ان کی ۹۲ بند کی طویل نظم اس کی شاہکار ہے، اس لئے انور خود کہتے ہیں 'یہ نظم مجھے اپنا اتنا بڑا انمایاں کامیابی دکھائی پڑ رہی ہے کہ آئندہ میرے لئے اب اس جیسے چند بند کہہ پانا بھی ناممکن سا ہے'۔

عشق نبی ﷺ سے سرشار ہوکر فرطِ عقیدت میں یوں نغمہ سنج ہیں:

تیرا مقام بلند مصرعِ بلغ العلا
تیری جس کا جلال آیۃ تبت یدیٰ
کون تعین کرے کیا ہے ترا مرتبہ
تجھ سے اور معبود میں ہے میم کا فاصلہ



تیرے لئے ایک گام عرش معلیٰ کی راہ
تیری غلامی کریں دہر کے سب کج کلاہ



رسول مقبول ہم سبھی کے دکھے دلوں کا سلام لے لو
ہماری آنکھوں سے بہنے والے ان آنسوؤں کا سلام لے لو
تمہاری چوکھٹ پہ ساری دنیا کے شاہ بھی ہیں فقیر
ذرا نگاہیں اٹھا کے اپنے گداگروں کا سلام لے لو
تمہاری فرقت میں لوگ دنیا کے گوشے گوشے میں مضطرب ہیں
جو لوگ قسمت سے آچکے ہیں ان عاشقوں کا سلام لے لو



جلوہ ٔ حسن الٰہی نورِ احمد بن گیا
کن کی تفصیلات کا وہ حرف ِ ابجد بن گیا
اولیں شہود وشاہد اوراشہد بن گیا
اس زمین پر جب وہ آیا تو محمد بن گیا



نورِ احمد جو بنے ٹکڑا اس کی نوری ذات کا
جو بلاشک ہے سبب تخلیق موجود ذات کا



وہ نبی جس کا فرشتوں پر بھی واجب احترام
وہ نبی روز اول سے ہے جو نبیوں کا امام
وہ نبی ہونا تھا جس کو ذات حق سے ہم کلام
وہ نبی بعد ازخدا ہے جس کا اعلیٰ ترمقام

دنیائے تغزل میں قدم رکھتے ہی بالعموم حسن وعشق کی صدائیں بازگشت ہی سنائی دیتی ہیں، شعراء عشق وعاشقی کے ساز سے ہر دل پر اپنا ایک اثر چھوڑتے چلے جاتے ہیں، درحقیقت غزل تو ہے بھی یہی 'حکایت بہ یار گفتن'۔ مگر اس حقیقت سے بھی مجال انکار نہیں جوں جوں حالات کا مذاق بدلا اسی طرح تغزل میں بھی تبدیلی آئی، حالات کے بدلے مذاق سے لطف اندوزی کے لئے انور کی غزلیہ شاعری کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

سیلاب آیا ڈوب گئی فصل دھان کی
پانی کے ساتھ بہہ گئی قسمت کسان کی
پہلے لوگوں میں محبت تھی ریاکاری نہ تھی
ہاتھ اور دل دونوں ملتے تھے اداکاری نہ تھی



ہواہو تیز تو شاخوں سے پتے ٹوٹ جاتے ہیں
ذراسی دیر میں برسوں کے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں

انور کی نظمیہ شاعری بھی ہر ایک کو دعوت فکر کے ساتھ آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتی ہے:

دوستو آؤاسی وقت وعدہ کرلیں
ہم کبھی جہد مسلسل سے نہ منہ موڑیں گے
ہم سدا عزم مصمم کا سہارا لے کر
جہل کی ہرکسی زنجیر کو ہم توڑیں گے
ہم سے وابستہ ہے مستقبل زریں کا فروغ
ہم نئے دور کی اقلیم کے شہزادے ہیں



جی ہاں! انور جلال پوری کی دنیائے شاعری حمد ونعت سے معمور ہے تو سماجی ناہمواریوں کی دلدوز داستان بھی شعری جامہ میں موجود ہے، ملی وقومی ہمدردی کی کسک دکھائی دیتی ہے تو فلمی نغموں میں حسن وعشق کی جھلک بھی۔ اسی طرح مذہبی پس منظر بھی ان کی شاعری میں ملتی ہے۔





شعور فکر کا اک آسمان

انیس حیدر انیسؔ
شاہ محمد پور، مبارک پور، اعظم گڑھ
موبائل نمبر 9889742629

شعور فکر کا اک آسمان تھے انور
علوم و فن کے لیے سائبان تھے انور

ادب کے شہر میں خاموشیوں کا عالم ہے
ہمارے ملک میں اردو کی جان تھے انور

جبیں جھکاتی تھی ہر شاخ گل جسے سن کر
وہ بلبلان چمن کی اذان تھے انور

نہ ان کے مثل ملے گا ہمیں کوئی ناظم
مشاعروں میں نظامت کی شان تھے انور

سمجھ میں آیا زمانے کو ترجمہ پڑھ کر
پوتر گیتا کے وہ ترجمان تھے انور

نچوڑ لیتے تھے لفظوں کے رس کو لہجوں میں
ادیب وقت تھے شیریں بیان تھے انور

بصد خلوص وہ ملتے تھے ہم نشینوں سے
ہمارے آپ کے جب درمیاں تھے انور

ہر ایک دل میں بنا لیتے تھے جگہ اپنی
بڑے شفیق بڑے مہربان تھے انور

دیا تھا ان کو حکومت نے بارہا اعزاز
سمجھ لو نازش ہندوستان تھے انور

بھرا ہے اس طرح رنگ شباب غزلوں میں
یہ لگ رہا ہے ابھی تک جوان تھے انور

بھلا سکے گی نہ دنیا کی محفلیں ان کو
ادب کی ایسی حسین داستان تھے انور

سجانے کیوں نہ جہاں اس کو اپنی پلکوں پر
جو سرنگوں نہ ہوا وہ نشان تھے انور

ہمیشہ ملک کو پیغام اتحاد دیا
یہ سچ ہے پیکر امن وامان تھے انور

خلا جو ان سے ہوا ہے وہ بھر نہیں سکتا
ادب کے اتنے بڑے قدر دان تھے انور

ادب شناس تھے رکھتے تھے خامیوں پہ نظر
عظیم ماہر اردو زبان تھے انور

ہزاروں آئے ہیں باہر سے تعزیت کے خطوط
پتا یہ چل گیا کتنے مہان تھے انور

پناہ ملتی تھی ہم جیسوں کو جہاں آکر
انیسؔ علم کا ایسا مکان تھے انور

آسمان ادب کا ستارہ



مختار معصوم املوی
مبارک پور، اعظم گڑھ
موبائل نمبر 09935107048

ہندوستان کے معروف شاعر و ناظم مشاعرہ جناب انور جلالپوری کے انتقال کی خبر سن کر نہایت صدمۂ ہوا۔ وہ نہیں مرے بلکہ ادب کے حقیقی بزم کی جانب ان کا انتقال ہوگیا۔ ادب کی دنیا میں غم کی فضا چھا گئی ۔ ہمارے ملک، ہمارا علاقہ ہی نہیں بلکہ پورے عالم میں جو اردو دنیا کا مضبوط قلعہ سمجھا جاتا تھا وہ بادسموم سے منہدم ہوگیا۔ بہرحال موت برحق ہے ہر چیز میں اختلاف مل سکتا ہے مگر موت میں نہیں ۔ ہر نفس کو موت کو مزہ چکھنا ہے یہ ہمارا ایمان ہے۔ محترم انور صاحب تو دنیا سے چلے گئے مگر ان کی ادبی تخلیقات کے توسط سے ان کا ہم سے رابطہ ہمیشہ برقرار رہے گا ان شاءاللہ مرحوم انور جلالپوری ایک بلند پائے کے شاعر تھے بعد میں مشاعرہ کے ناظم ہوئے چونکہ ان کے پاس اتنی صلاحیت چابکدستی اور بصیرت تھی کہ وہ بین الاقوامی شہرت یافتہ ادیب بن گئے ۔لفظوں کے جال میں خیالات کو اسیر کر لینے کا فن انہی کو حاصل تھا۔ ہم ان کے سنتے تھے اور انہیں سے سیکھتے تھے۔

انور صاحب کی نظمیں اور غزلیں تکیوں کے نیچے رکھ کر آنسوؤں سے سینچتی جاتی ہیں ۔ ان کا تمام تر کلام پرانی بوتلوں میں نئی شراب کے مصداق ہے ۔ وہ اپنے شعری پیمانے میں ہر قسم کی شراب رکھتے تھے ۔ انور صاحب کی شاعری زندگی کے نشیب و فراز، پیچ و خم سے ہنستی کھیلتی، کودتی، مچلتی، ہمکتی، بل کھاتی ہوئی اک بہت بلندی پر پہنچ گئی جہاں سے پستی کی طرف لوٹنا ممکن نہیں مرحوم انور جلالپوری نے عہد حاضر کے اضطراب و مصائب کے وحشت انگیز مہیب راستوں پر لفظوں کے چراغ جلائے ہیں ۔ جن کی روشنی ہر مسافر کی تھکن لے کر دنیا کے سرمایہ داروں کی جگمگاتی کوٹھیوں پر مظاہرہ کرتی ہے ۔ ان کے یہاں مکمل شاعرانہ رکھ رکھاؤ اور مفکرانہ رجاؤ ملتا ہے ۔ سوز و گداز کا اتھاہ سمندر انگڑائیاں لے رہا ہے ۔ انہوں نے غزل کی لطافت کا ہمیشہ خیال رکھا ہے ۔ اس کے حسن و نکھار میں کبھی کوئی کمی نہیں آنے دی ۔ اس کی فضا کو اپنے ہونٹوں کے ترنم سے ابھارا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ محترم انور جلالپوری کی قبر کو موجودہ وقت میں یا سیکڑوں برس بعد بھی سونگھا جائے تو اردو ادب کے متوالوں ، بالخصوص محبوں نیز جلالپور کے ہم وطنوں کو انور جلال پوری کی تراب قبر سے جانثار اردو ادب کی بو آئے گی۔

انور جلال پوری کا کلام مطالعہ کرنے کے بعد اور ان کی ماہرانہ نظامت سن کر میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ اک فطری شاعر اور ناظم مشاعرہ تھے، اس لیے کہ ان کے یہاں تنوع کے ساتھ حسن بھی ہے اور پختگی بھی شاعری ان کے گھر کی خادمہ ہے مگر اس کے ساتھ ان کا اسلوب اک دوستی کے جیسا تھا اور کسی شاعر کے لیے اک سہیلی کے جیسا ہے ۔ انہوں نے سمندر کے سارے پانی کو زمین کی صراحی میں بند کر کے رکھ دیا ۔ اب پینے والوں کا ظرف ہے وہ اسے کتنا پئیں اور اپنے قلوب روح کی تسکین کا کتنا سامان حاصل کرتے ، اگر کوئی طالب علم جو میر کے سوز و گداز ، خواجہ میر درد، مومن کی پاکیزگی ، ظفر کا حزن و ملال ، غالب کا فلسفۂ تصوف، حالی و مولانا حسرت موہانی کی وطن پروری، اقبال کے مرد مومن کی شان و عظمت ، ریاض خیرآبادی کا شکوۂ الفاظ، جگر مرادآبادی کا

جذبہ عشق اور فراقؔ کے ہجر و وصال کو ایک جگہ تمام تر جلوہ آرائیوں کے ساتھ دیکھنا چاہے تو میں اسے مشورہ دونگا کہ وہ مرحوم انور جلالپوری کے کلام کو ڈوب کر سنے اور پڑھے بھی، میرا دعویٰ ہے کہ مرحوم انور جلالپوری کی ذات ادب کی تاریخ کی پیشانی پر تازہ تراشے ہوئے جھومر کی طرح روشن ہے اور ایسا کیوں نہ ہو وہ جب مشاعروں میں تقریر اور گفتگو کرتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کسی ادبی ادارے روشن دان سے چھن کر آیا ہوا نور دنیائے ادب کو روشن کر رہا ہو، مرحوم سے میں شاعری کے گل بوٹے سیکھتا تھا اور میری مرحوم سے فون پر باتیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ انہوں نے مجھے بہت حوصلے دیئے اور دعاؤں سے بھی نوازا اور اکثر کہا بھی کرتے تھے کہ مختار معصومؔ مجھ کو تمہاری صلاحیت پر بھروسہ ہے۔ مگر نظامت کا میدان بہت کٹھن اور مشکل ترین ہے۔ بہت سے لوگ اس میدان میں آئے بھی اور تھک کر بیٹھ گئے اور اب میں تم کو دیکھتا ہوں کہ تم نظامت کے فرائض کہاں تک نبھاتے ہو اور یہ بھی مجھ کو درس دیتے تھے کہ نظامت کا مطلب یہ نہیں کہ صرف اشعار سنا کر شاعر کو آواز دیدی جائے۔ اشعار قوال کو بھی تو دو، ڈھائی سو یاد رہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں وہ مشاعرہ کا ناظم بن جائے۔ اگر نظامت کرنی ہو تو نثر نگاری کی جائے۔ اس لیے کہ اگر مشاعرہ میں ایک ہزار کا مجمع ہے تو اس میں کچھ ادباء و دانشوران بھی تشریف فرما ہیں۔ ہمیں ان کو دیکھ کے بولنا ہے اگر کوئی پارٹی یا کمیٹی یا کوئی انجمن مشاعرہ کرتی ہے تو انہیں ادباء و دانشوران جب مشورہ دیں گے تو اس میں ہمارا نام آئے گا اور ہم کامیابی کی طرف زینہ بزینہ بڑھتے رہیں گے۔

محترم انورؔ جلالپوری کے رقیب برادران انہیں جو چاہیں سمجھیں، مگر مختار معصومؔ املوی کی نگاہ میں انورؔ صاحب شاعری کے میدان میں وہ ایک مصلح، اک مفکر بھی تھے، شاعر بھی تھے ادیب بھی تھے، خطیب بھی تھے، فقیہ بھی تھے، مبلغ بھی تھے، معلم بھی تھے، عالم بھی تھے، فاضل بھی تھے، ٹیچر بھی تھے، ٹیوٹر بھی تھے، لکچرر بھی تھے، پروفیسر بھی تھے۔

ماہر علم نجوم بھی تھے، منطقی بھی تھے، فلاسفر بھی تھے، سائنس داں بھی تھے اور سب سے بڑھ کر ہماری نظر میں اک سچے انسان بھی تھے۔

میں اک طالب علم ہوں کتاب خوانی سے میرا رابطہ ہے۔ عمر کتاب خوانی میں گزر رہی ہے۔ یہ بات میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ مرحوم انورؔ جلالپوری کی شاعری کا وسیع و عریض محل اتنا حسین اور دلکش ہے کہ اس کی ابدیت کے خواب دیکھے جا سکتے ہیں۔ اللہ ان کی شاعری اور نظامت کو اتنی بلندی بخش دے کہ مرحوم انورؔ جلالپوری کے دینی و ادبی کلام کو پڑھنے کے لیے واعظوں کو اپنی دستار سنبھالنی پڑے۔

وہ سخنور کی شان رکھتے تھے : اک اچھوتا بیان رکھتے تھے
آہ وہ شاعروں کی محل میں : اک نئی آن بان رکھتے تھے
ہم نہ بھولینگے ان کی شیرینی : وہ دہن میں زبان رکھتے تھے
کیوں نہ دیتے فروغ اردو کو : دل میں عزم جوان رکھتے تھے
دل دو پارہ کریں جو دشمن کا : ایسے تیر و کمان رکھتے تھے
کہہ دو معصومؔ دوش پر انورؔ : شاعری کا نشان رکھتے تھے

بس آخر میں دعا گو ہوں کہ اللہ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ مرحوم کو اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ اللہ اپنی رحمت نازل فرمائے۔ مرحوم کی قبر کو اللہ نورانی فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

ایک نظر ادھر بھی

کوئی بھی ایک اردو کا رسالہ ٗ اخبار خرید کر پڑھیں اور اپنے مہمان خانے کی زینت بنائیں۔

*****

اپنے دستخط اردو میں کرنے کی عادت ڈالیں۔

*****

اپنے گھر پر نام کی تختی اردو میں لگائیں۔

.....مدیر



میری نظامت کا سنگم
ملک زادہ منظور احمد اور عمر قریشی

قاضی عبدالرحمٰن
غازی روضہ، گورکھپور
موبائل نمبر 9936046287

”اسٹار مشاعرہ کمیٹی کی جانب سے ہر سال ہونے والے کل ہند مشاعرے کی نظامت کی ذمہ داری انور جلالپوری کے کاندھے پر ہوتی مگر ۲۰۱۶ میں جب وہ نظامت کے لیے آئے اور جیسے ہی نظامت کی باگ ڈور سنبھالی سامعین میں سے کچھ لوگ مسلسل ہوٹنگ پر اتر آئے جس سے انہوں نے بیحد تکلیف ہوئی اور انہیں گورکھپور نہ آنے کا فیصلہ کیا۔ دراصل یہ سب کچھ لوگوں کی منصوبہ بند حرکت تھی۔ اس موقع پر صحافی قاضی عبدالرحمن کا ان سے لیا گیا ایک انٹرویو پیش ہے۔ “ **ادارہ**

ایک باکمال خطیب، ناظم مشاعرہ، کامیاب شاعر اور پروقار اردو تہذیب کی علامت انور جلالپوری کے انتقال سے پیدا ہوا خلا پر ہونا مشکل ہے، ان کے بارے میں بہت سی باتیں کہیں جائیں گی لیکن سچ یہی ہے کہ ان کا مجموعی محاکمہ کیا جائے تو ایک ذہین اور دل آویز شخصیت کی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ مشاعروں کی نظامت کے لیے یوں تو وہ متعدد بار گورکھپور آئے لیکن اسٹار مشاعرہ کمیٹی کے کنوینر ڈاکٹر وجاہت کریم کے ذریعہ مظہر علی شاہ کی یاد میں کرائے جانے والے مشاعرے میں وہ ۲۰۱۶ میں گورکھپور تشریف لائے اور یہی ان کا گورکھپور کا آخری سفر رہا۔ وہ یہاں ایک معروف ہوٹل میں ٹھہرے تو اخبار کے نمائندے کی حیثیت سے راقم الحروف نے ان سے اردو زبان مشاعرے اور نئی نسل سے اردو کا تعلق کے حوالے سے گفتگو کی تو ان کی بصیرت اور ان کا کرب دونوں پوشیدہ نہ رہ سکتے۔ پیش خدمت ہے انہیں سوالات کے جوابات۔

س۔ مشاعروں کی دنیا میں ادھر جو تبدیلی آئی ہے اس پر آپ کی کیا رائے ہے؟

ج۔ پچاس برس پہلے جب میں مشاعرے کی طرف آیا تھا تو اس وقت پوری ایک نسل موجود تھی جو اردو پڑھتی، لکھتی اور بولتی تھی، اور رابطے کی زبردست زبان بھی تھی۔ لیکن گزشتہ نصف صدی میں اتنے تغیرات آئے کہ قدروں کی جڑیں ہل گئیں تبدیلی فطری عمل ہے۔ مگر بہتر صورت سامنے آئے تو یہ تبدیلی تعمیری ہوتی ہے لیکن موجودہ دور کی تبدیلی میں بگاڑ زیادہ ہے، انحطاط ہے اور مشاعرے کا اسٹیج بھی اس سے محفوظ نہیں ہے۔

س: کیا تبدیلی آگئی ہے؟ اس پر کچھ روشنی ڈالیں گے؟

ج: پچاس برس پہلے مشاعرے کا اسٹیج مکمل اردو زبان کا اسٹیج ہوتا تھا پھر کئی زبانوں کا مشاعرہ اور کوی سمیلن ساتھ ساتھ ہونے لگے اس کے دوسرے اثرات مرتب ہوئے، رہی بات قدروں کے زوال کا تو اس کا مشاہدہ آپ گھر سے قانون ساز اداروں تک کر سکتے ہیں۔

س: آپ نے نظامت کی دنیا میں قدم رکھا تو پروفیسر ملک زادہ

منظور احمد اور عمر قریشی جیسے باکمال ناظم مشاعرہ موجود تھے۔ جن کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا۔ پھر آپ نے اپنی راہ کیسے نکالی۔

ج: جی! آواز کے شہنشاہ عمر قریشی کی نظامت میں اتنی کشش تھی کہ لوگ کھنچے چلے آتے ہیں۔ میں بھی انہیں میں تھا جہاں تک نظامت کا تعلق ہے تو میں نے پروفیسر ملک زادہ منظور احمد اور عمر قریشی دونوں سے کسب فیض کیا۔ انہیں دو چراغوں کی روشنی سے میں منور ہوا ہوں یا یوں کہئے کہ میں پروفیسر ملک زادہ منظور احمد اور عمر قریشی کا سنگم ہوں یہ میری خوش بختی ہے کہ دونوں میری شخصیت میں سما گئے اور ان کے امتزاج سے میری انفرادیت ابھرتی ہے۔

س: مشاعروں کی نظامت میں کلیدی رول آواز کا ہوتا ہے یا پھر مطالعہ کا اور کامیاب مشاعرہ کے لیے کون سا ایسا وصف ہے جو ضروری ہے؟

ج: سوال آخری حصے کا جواب میں پہلے دیتا ہوں مشاعروں میں مختلف ذہنی سطح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کی سطح کو پہچاننا اور اپنے معیار کو برقرار رکھنے کا وصف نہ ہو تو ناظم مشاعرہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔ ناظم مشاعرہ کی آواز پر وقار ہونی چاہئے۔ جو سامعین سماعت پر بھاری پڑے۔

س: شاعری میں اب سماجی شعور سیاسی شعور بن گیا ہے جسے لوگ فیشن کے طور پر اپنا رہے ہیں۔ اس پر آپ کیا کہیں گے؟

ج: شاعری میں تبدیلی اچھی چیز ہے مگر موثر ہونی چاہئے یہ جوہر تب پیدا ہوتا ہے جب کلام میں تاثیر ہو آج کل شاعری براہ راست گفتگو کرنے لگی ہے۔ جو شاعری کے لیے سم قاتل ہے۔ اب اسی فیصد شعر دیوناگری میں کلام لکھتے ہیں اور یہ کسی المیہ سے کم نہیں، اب خالص شاعر نہیں رہے اب مشاعرہ اسٹیج آرٹ ہوگیا ہے، پہلے مشاعرے کے اسٹیج پر سردار جعفری، کیفی اعظمی، وامق جونپوری،، فراق گورکھپوری اور خمار بارہ بنکوی جیسے شعرا ہوا کرتے تھے، اب تو اسٹیج بہت ہلکا ہوگیا ہے۔

س: مشاعروں کے اس زوال کے پیچھے کیا سبب نظر آتا ہے؟

ج: دیکھئے پہلے مشاعرہ ادبی ہوتا تھا کسی صاحب اقتدار کی سفارش پر کسی شاعر کو مدعو نہیں کیا جاتا تھا۔ میں نے نظامت شروع کی تو مشاعروں پر عتاب کا دور شروع ہوگیا تھا اور اس میں پیسوں کا بڑا دخل ہو گیا تھا اور اب مشاعروں کی نوعیت تبدیل ہوگئی، ساری ساری رات مشاعرہ ہوتا ہے اور اب اس کا مقصد ادبی نہ ہو کر تجارتی ہوگیا ہے کوئی بڑا سرمایہ دار خرچ کر کے شاعروں کو ایسے مدعو کرتا ہے جیسے بازار میں چوراہے سے بیلداروں کو بلایا جائے، میری تو شعرا سے یہی اپیل ہے کہ وہ ادبی بیلدار نہ بنیں بلکہ اپنے ادبی وقار کو پہچانیں، گداگری شعرا کو راس نہیں آتی، پہلے مشاعرہ تہذیبی قوت تھا اس میں سبھی مذاہب کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ اس سے باہمی اتحاد فکر و خیال کی آزادی کے بعد بھی عظمت انسانیت جھلکتی تھی۔ اب مشاعرہ گاہ پھوہڑ جگہ بن گئی ہے۔ غیر معیار کمینٹ نے اسے اور بھی مجروح کیا ہے۔ مشاعرے تو اب ٹی وی پر بھی ہوتے ہیں۔ ٹی وی کے مشاعرے زبان کی مقبولیت میں تو کام آئے گی مگر مشاعرہ گاہ جیسا ماحول نہیں دے سکے گی۔

س: مشاعروں کی نظامت کا مستقبل کیسا ہے؟

ج: جیسے مشاعروں کا مستقبل ہے اب ناظم مشاعرہ تو اینکر کے رول میں ہیں اور شاعر کلام سے زیادہ آواز پر یا سیاسی وابستگی پر بھروسہ کرنے لگے ہیں۔ یوپی میں اردو کی صورت حال زیادہ خراب ہے، بہار میں حالت بہتر ہے۔

س: آپ نے شاعری بھی کی ہے اور منظوم ترجمے بھی ظاہر ہے کہ ایک سے زیادہ زبان پر قدرت ہوگی تبھی یہ فریضہ انجام پاتا ہے؟

ج: جی میں نے گیتا کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ ٹیگور کی گیتانجلی کا بھی منظوم ترجمہ کیا ہے۔ کچھ عمر خیام کی رباعیوں کا بھی اردو ترجمہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید کے تیسویں پارے کا بھی اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔

س: اب ایک آخری سوال کیا آپ اپنے کام سے مطمئن ہیں؟

ج: ہرگز نہیں جو کہنا تھا وہ نہ کہہ سکا جو کرنا تھا وہ پورا نہ ہوا۔ اطمینان صرف اتنا ہے کہ مشاعروں کے حوالے سے اردو کا سفیر بنا ہوا ہوں۔

منظوم سورۃ الفاتحہ

ہے تعریف ساری خدا کے لیے
جو کن کہہ دے اور ساری دنیا بنے

وہی رب تو سارے جہانوں کا ہے
مکانوں کا ہے لا مکانوں کا ہے

رحیم اور رحمٰن بھی اس کے نام
چلائے وہی سارے جگ کا نظام

قیامت کے دن کا مالک وہی
اسی کے اشارے سے دنیا سجی

تری ہی عبادت سے ہے واسطہ
مدد کے لیے ہے تجھی سے دعا

بس اب نیک انساں بنا دے ہمیں
جو ہے سیدھا راستہ دکھا دے ہمیں

وہ رستہ جو انعا م والوں کا ہے
ترے سچے پیغام والوں کا ہے

نہ ان کا چلیں ہم کبھی راستہ
الٰہی غضب جن پہ تیرا ہوا

ہمیشہ سے ہے ذلیل اور خوار
بچا لے ہمیں ان سے پر ور دگار

منظوم سورہ النبا

یہ کیا جاننا چاہتے ہیں بھلا
یہ کیا پوچھنا چاہتے ہیں بھلا
قیامت کی ان کو خبر ہی نہیں
ہے جو اصل ڈر اس سے ڈر ہی نہیں
بہت جلد پہچان جائیں گے سب
کہ ہم کون ہیں جان جائیں گے سب
ہمیں نے بچھایا یہ فرش زمیں
اور اس سچ کی ان کو خبر ہی نہیں
زمیں کا توازن پہاڑوں سے ہے
پہاڑوں کی تعبیر میخوں سے ہے
تمہیں ہم نے جوڑوں سے پیدا کیا
چلا مردو عورت کا یوں سلسلہ
تمہیں نیند کی ہم نے دولت بھی دی
سکون دل و جان کی نعمت بھی دی
جو دی رات آرام کے واسطے
اجا لا ہے دن کام کے واسطے
تمہارے لیے تم پہ روشن نشاں
بنائے ہیں مضبوط سات آسماں
چراغ ایک ایسا کہ سورج کہیں
اجالوں میں اپنے پرائے رہیں
لگاتار دھرتی پہ با رش ہوئی
اناج اور گھنے باغ سبزی اگی

قیامت کا دن فیصلے کا ہے دن
کہ ایک جا نظر آئیں گے انس و جن
فرشتہ کچھ اس طرح پھو نکے گا صور
نکل آئیں گے سارے اہل قبور
بنیں گے سبھی آسمانوں میں در
فلک جس کو کہتے ہیں ہوگا کھنڈر
وہاں ریت ہو گی جہاں ہیں پہاڑ
کہ پل بھر میں ہو گی یہ دنیا اجاڑ
جہنم جو ہے وہ بھی اک گھات ہے
جہاں سر کشوں سے ملا قات ہے
یہ سرکش رہیں گے وہاں مدتوں
نہ کھا پائیں گے کچھ جہاں مدتوں
ملے گا تو بس گرم پانی وہاں
ہے موجود زخموں کا دھووں جہاں
نہ تھے جانتے کیا ہے روز حساب
کہ اک روز دینا ہے سب کا جواب
عمل ان کے گن گن کے سب لکھ لیے
مگر بے خبر بے خبر ہی رہے
ہماری نشانی کو کہتے تھے جھوٹ
یہ بد بخت سب کو سمجھتے تھے جھو ٹ
مگر ان کی قسمت میں اب ہے عذاب
نہیں بچ سکیں گے یہ خانہ خراب
جو ہیں متقی ان کا جنت ہے گھر
کہ باغ عنب ان کا ہے مستقر
وہاں ان کے نوخیز جوڑے بھی ہیں
جو ہم سن ہیں ان سے ہی رشتے بھی ہیں

ملے گا وہاں ان کو جام حیات
مسرت سے گزریں گے دن اور رات
کوئی بات جھوٹی نہ ہو گی وہاں
نہ ہو گی کوئی لغو کی داستاں
وہ رب جو زمیں آسمانوں کا ہے
مکانوں کا ہے لا مکانوں کا ہے
نہیں سامنے جس کے بولے کوئی
زباں تک کبھی بھی نہ کھولے کوئی
وہی دے گا انعام کی نعمتیں
اسی کے ہیں قبضے میں سب برکتیں
ملک اور جبریل ہوں گے کھڑے
خمو شی کا پیکر نظر آئیں گے
ملے گی اجا زت جو رحمان سے
تو بولے گا پھر کوئی ایمان سے
خبر سب کو اس دن کی دے دی گئی
کوئی بات اس میں نہیں چھپی
جو چاہے وہ اس راستے پر چلے
جسے شوق ہو اس سے پیچھے ہٹے
عذاب قیامت بتایا گیا
نہیں اس میں کچھ بھی چھپایا گیا
نہ ما نو تو دیکھ گے اک روز تم
حواس ور ہوش ہوں گے اس وقت گم
جو کا فر ہیں حیرت میں پڑ جائیں گے
زمیں ندامت میں گڑھ جائیں گے

بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ

شلوک نمبر۔۱۰

ہمیں فخر بھیشم پتامہ پہ ہے
کہ جن کا اثر ساری دنیا پہ ہے
وہی اپنی فوجوں کے سالار ہیں
بہادر ہیں یادوں کے بھی یار ہیں
وہ رک جائیں یہ مانتے ہی نہیں
پراجے ہے کیا جانتے ہی نہیں
مگر اپنے دشمن بھی کچھ کم نہیں
انہیں مرنے جینے کا کچھ غم نہیں
وہاں پانڈووں کی عجب شان ہے
کہ لاکھوں میں بھی ان کی پہچان ہے
ہیں بھیم ان کے سالار میدان میں
جھکے ہیں سبھی ان کے سمان میں
گرو جی یہی اب ہے میرا گماں
کسی سے کوئی کم نہیں ہے وہاں
مگر جیت کا مجھ کو وشواس ہے
مرے ساتھ دھرتی ہے آکاش ہے

شلوک نمبر۔۱۱

اب اس حال میں کو رووں جان لو
حقیقت ہے کیا اب اسے مان لو
سدا اب یہی شان و شوکت رہے
پتامہ کی عزت سلامت رہے
جو ہے جس جگہ بس وہیں پر رہے
کمر ہی جھکے اور نہ سر ہی جھکے

شلوک نمبر۔۱۲۔۱۳

بہا در پتامہ کھڑے ہوگئے
بلندی پہ پھر حوصلے ہوگئے
وہ عظمت کا طاقت کا مینار ہیں
وہ اس جنگ کا ایک معیار ہیں
پتامہ کا بجنے لگا شنکھ جب
تو میداں میں گھبرا گئے سب کے سب
کہیں ڈھول ، مردنگ گھونگھے بجے
تو سب ڈر گئے ان کی آواز سے
بہت خوش ہوئے سن کے دریودھنا
بگڑتا ہوا کھیل جیسے بنا

شلوک نمبر۔۱۴

ادھر کرشن و ارجن بھی بیتاب ہیں
یہ دونوں ہی خورشید و مہتاب ہیں
وہ رتھ جس کے گھوڑون کی اک شان ہے
سفیدی ہی گھوڑون کی پہچان ہے
اسی رتھ سے جب شنکھ بجنے لگے
تو پھر فوج کے روپ سجنے لگے
وہی شنکھ جو آسمانی بھی ہے
حقیقت بھی ہے اور کہانی بھی ہے

شلوک نمبر۔۱۵

وہی شنکھ تھا پانچ جن جس کا نام
دکھایا اسی شنکھ نے اپنا کام
کرشنا کی اس میں چھپی شان تھی
یہی پانچ جنیہ کی پہچان تھی
بجایا دھنجے نے جس شنکھ کو
اسے پیار سے دیودتا کہو
اٹھ بھیم اور پونڈرا بج گیا
لڑائی کا میدان بھی سج گیا

شلوک نمبر۔۱۶،۱۷،۱۸

انتا وجے نام جس کا پڑا
یدھشٹھر نے اس شنکھ کو چن لیا
نکل ور سہد یو بھی خوش ہوئے
سگھوش اور منی پشپکا جب بجے
وہ ہوں ساتیکی یا ہوں کاشی کے شاہ
بجے شنکھ کب اس کی سب پر نگا ہ
دھرم شٹایمن اور راجہ وراٹ
شکھنڈی کا بھی دیکھئے ٹھا ٹھ باٹ
سبھی اپنے شنکھوں کے ماہر بھی ہیں
چھپے ان کے گن اور ظاہر بھی ہیں

شلوک نمبر۔۱۹

بڑا شور ہنگا مہ شنکھوں کا تھا
تما شا عجب سارے ویروں کا تھا
لرزنے لگے کو رووں کے بھی پاؤں
لگا ، دھوپ سے اب ملے گی نہ چھاؤں
مگر جنگ کرنے کا بھی شوق تھا
عجب فیصلہ تھا عجب ذوق تھا

شلوک نمبر۔۲۰

تھی تیار بھیشم پتا مہ کی فوج
گر جدار جیسے سمندر کی موج
یہ مو قع تھا تیروں کی برسات کا
تصور سے آگے کے حالات کا
یہ منظر جو ارجن کو آیا نظر
اٹھا یا دھنش اس نے بھی بے خطر
نشان اس کے جھنڈے پہ بندر کا تھا
مزاج اس کی لیکن قلندر کا تھا
اٹھا کر دھنش سارتھی سے کہا
یہیں سے ہے اپدیش کا سلسلا

شلوک نمبر۲۱،۲۲،۲۳

کہا اس نے اے مالک روح و جاں
یہ رتھ لے چلیں فوج کے درمیاں
میں دیکھوں کہ ہیں کون سے جنگ جو
گنوانے کو آئے ہیں جو آبرو
کسے حوصلہ مجھ سے لڑنے کا ہے
نہیں غم کسے گھر اجڑنے کا ہے
وہ ہیں کون جو آج تیار ہیں
دماغ اور دل سے جو بیزار ہیں
انہیں شوق خوش ہوں گے دریودھنا
وہ کیا جانیں کیا کیا ہے بگڑا بنا

گیتانجلی کا منظوم ترجمہ

تری مرضی

تری مرضی بنایا تو نے لا محدود مجھ کو بھی
یہ عزت بخش دی ہے، اے مرے معبود مجھ کو بھی

مری ہستی تو سچ مچ اک بہت کمزور پیالہ ہے
اسی پیالے میں میری زندگی بھر کا نوالہ ہے

تو خالی بھی کرے اور پھر اسی پیالے کو بھرتا ہے
نئی اک زندگی تو خود اسی پیالے میں دھرتا ہے

پہاڑوں، گھاٹیوں میں تو اسے لے لے کے جاتا ہے
یہ ہے وہ بانسری جس کا فضاؤں تک میں نغمہ ہے

جو اس کے سر، جو راگ اس کے، ہے کافی تازگی ان میں
نیا پن ہر طرح کا ہے، نئی ہے زندگی ان میں

ترے چھونے سے چھوٹا سا مرا دل جھوم اٹھتا ہے
امر بولوں سے پھر ساری فضا میں گنگناتا ہے

جو تری بخششیں ہیں وہ مرے ہاتھوں کو ملتی ہیں
ہزاروں سال تک یہ بخششیں مجھ پر برستی ہیں

◆◆◆

اجلا

مرے مالک میں کیا جانوں کہ نغمہ تیرا کیسا ہے
بڑی حیرت سے میرا دل ترا سنگیت سنتا ہے

ترے نغمات سے ہی ساری دنیا میں اجالا ہے
ترے نغموں کا چلتا آسمانوں تک میں سکہ ہے

ترے نغموں کی دھارا پتھروں کو توڑ دیتی ہے
ہیں جتنے نرم دل سارے دلوں کو جوڑ دیتی ہے

مری خواہش ہے تیری لَے سے اپنی لَے ملاؤں میں
مگر جو کامیابی ہے اسے ہرگز نہ پاؤں میں

مری یہ آرزو گاؤں مگر نغمے سے ہوں عاری
میں بدقسمت ہوں اے مالک مری آواز ہے بھاری

نہیں آزاد میرا دل مرا دل ایک قیدی ہے
مرے مالک میں خوش ہوں ہاں اگر یہ تیری مرضی ہے

◆◆◆

بھجن

بھجن، مالا میں اور منتروں میں کچھ بھی تو نہ پائے گا
یہ ایسے کام ہیں جن میں تو اپنے کو گنوائے گا

کواڑوں کو بھی کر کے بند کس کو پوجتا ہے تو
اکیلے ایک گوشے میں یہ کس کو دیکھتا ہے تو

تو کھول آنکھیں خدا تیرا دکھائی ہی نہیں دیتا
اسے تیرا فسانہ کچھ سنائی ہی نہیں دیتا

خدا ہے اس جگہ انساں جہاں دھرتی کو گوڑے ہے
سڑک تعمیر ہو اس واسطے پتھر کو توڑے ہے

خدا سردی میں گرمی میں انھیں کے ساتھ رہتا ہے
وہ مٹی میں اَٹے کپڑوں کو با رونق سمجھتا ہے

پجاری پھینک یہ پوجا کی چادر، اس طرف کو آ
بنا لے دھول میں اپنا مقدر، اس طرف کو آ

جہاں ڈھونڈے گا تو مکتی وہاں مکتی نہ پائے گا
سمے جتنا ہے تیرے پاس تو اس کو گنوائے گا

خدا ہے جو وہی مخلوق کا خالق بھی کہلائے
ہمارے مسئلے جو ہیں وہی تو ان کو سلجھائے

دعا

سدا کے واسطے اس سے ہمارا ایک رشتہ ہے
ہمیں اس نے محبت کی ہی اک ڈوری میں باندھا ہے

تو اپنے گیان سے اور دھیان سے باہر نکل کر آ
تو پوجا پاٹ کے ابھیمان سے باہر نکل کر آ

نہ کر کچھ فکر جو کپڑے پھٹے ہیں اور پرانے ہیں
یہ محنت کش ترے اپنے ہیں تجھ کو خوب جانے ہیں

انہیں میں آ کے مل جا اور پسینہ پوچھ ما تھے تھے
تجھے مکتی ملے گی صرف ان لوگوں میں رہنے سے

دعا یہ ہے کہ میں جب تھک چکوں تو نیند آ جائے
مرا وشواش ایسی تندرستی مزہ پائے

پرستش کے لیے میری جو تیاری نہ اچھی ہو
مرے احساس کے اندر کی بیماری نہ اچھی ہو

کبھی مجبور اپنی آتما کو میں نہ کر پاؤں
کبھی جھوٹی تسلی سے میں اپنا دل نہ بہلاؤں

ہے تو بھی ڈالتا دن کی نظر پر رات کا پردہ
کہ جب آئے سحر تو سب نظر آئیں تر و تازہ

غزلیات

کبھی پھولوں کبھی خاروں سے بچنا
سبھی مشکوک کرداروں سے بچنا
حریفوں سے بھی ملنا گاہے گاہے
جہاں تک ہو سکے یاروں سے بچنا
جو مذہب اوڑھ کر بازار نکلیں
ہمیشہ ان ادا کاروں سے بچنا
غریبوں میں وفا ہے ان سے ملنا
مگر بے رحم زرداروں سے بچنا
حسد بھی ایک بیماری ہے پیارے !
ہمیشہ ایسے بیماروں سے بچنا

جو شخص زمانے کے خداؤں سے لڑا ہے
سقراط ہوا ہے کبھی سولی پہ چڑھا ہے
اللہ کرم کر! کہ بہت تیز ہوا ہے
غربت ہے سیہ رات ہے صرف ایک دیا ہے
سایہ جو تبرک کی طرح بانٹ رہا ہے
صدیوں سے کڑی دھوپ میں وہ پیڑ کھڑا ہے
ہر لمحہ اک گام مسائل کی ہے زنجیر
اس دور میں جینا بھی کوئی جیسے سزا ہے
لوٹ آئے تو ذلت ہے بڑے تو ہے مصیبت
اک شخص دو راہے پہ کھڑا سوچ رہا ہے
لو ہے کا جگر جس کا تھا فولاد کا بازو
تھک ہار کے اس نے بھی کفن اوڑھ لیا ہے

پیار کو صدیوں کے اک لمحے کی نفرت کھا گئی
اک عبادت گاہ یہ گندی سیاست کھا گئی
بت کدوں کی بھڑ میں تنہا جو تھا مینار حق
وہ نشانی بھی تعصب کی شرارت کھا گئی
مستقبل فاقوں سے چہروں کی بشاشت چھین لی
پھول سے معصوم بچوں کو بھی غربت کھا گئی
عیش کوشی بن گئی وجہ زوال سلطنت
بے حسی کتنے شہنشاہوں کی عظمت کھا گئی
آج میں نے اپنے غم کا اس شکوہ کر دیا
ایک لغزش زندگی بھر کی عبادت کھا گئی

سوچ ہوں گھر آنگن میں ایک لگاؤں آم کا پیڑ
کھٹا کھٹا ، میٹھا میٹھا یعنی تیرے نام کا پیڑ
اک جوگی نے بچپن اور بڑھاپے کو ایسے سمجھا
وہ تھا مرے آغاز کا پودا یہ ہے مرے انجام کا پیڑا
سارے جیون کی اب اس سے بہتر ہو گی کیا تشبیہ
بھور کی کونپل صبح کے میوے دھوپ کی شاخیں شام کا پیڑ
کل تک جس کی ڈال ڈال پر پھول مسرت کے کھلتے تھے
آج اسی کو سب کہتے ہیں رنج و غم و آلام کا پیڑ
اک آندھی نے سب بچوں سے اس کا سایہ چھین لیا
چھاؤں میں جس کی چین بہت تھا جو تھا بڑے آرام کا پیڑ
نیم ہمارے گھر کی شوبھا جامن سے بچپن کا رشتہ
ہم کیا جانیں کس رنگت کا ہوتا ہے بادام کا پیڑ

شاداب و شگفتہ کوئی گلشن نہ ملے گا
دل خشک رہا تو کہیں ساون ملے گا
تم پیار کی سوغات لیے گھر سے تو نکلو
رستے میں تمہیں کوئی بھی دشمن نہ ملے گا
اب گزری ہوئی عمر کو آواز نہ دینا
اب دھول میں لپٹا ہوا بچپن نہ ملے گا
سوتے ہیں بہت چین سے وہ جن کے گھروں میں
مٹی کے علا وہ کوئی برتن نہ ملے گا!
اب نام نہیں کام کا قائل ہے زما نہ
اب نام کسی شخص کا راون نہ ملے گا
اب قید میں خوش رہنے کے عادی ہیں بڑے لوگ
اب اونچے مکانات میں آنگن نہ ملے
چاہو تو مری آنکھوں کو آئینہ بنا لو !
دیکھو تمہیں ایسا کوئی درپن نہ ملے گا

یہ ٹوٹی پھوٹی سی تقدیر جو ہے میری ہے
یہ میرے پاؤں میں زنجیر جو ہے میری ہے
میں جنگ ہار کے بھی معتبر سپاہی ہوں
مری نیام شمشیر جو ہے میری ہے
کبیرؔ و تلسیؔ و رسکھانؔ میرے اپنے ہیں
وراثت ظفرؔو میرؔ جو ہے میری ہے
میں تم کو دیکھ کے خود کو تلاش کر تا ہوں
تمہاری آنکھوں میں تحریر جو ہے میری ہے
میں خواب دیکھ چکا ہوں تو میرے خوابوں کی
بھلی بری سہی تعبیر جو ہے میری ہے
میں کائنات کا ادنیٰ وجود ہوں لیکن
زمیں فلک کی یہ جاگیر جو ہے میری ہے

دلوں میں زخم لبوں پر ہنسی زیا دہ ہے
ہمارے عہد میں بے چہرگی زیادہ ہے
جہاں ہے پیار وہیں رنجشیں بھی دیکھو گے
جہاں غرض ہے وہاں دوستی زیادہ ہے
نہ کوئی رونے کا منظر نہ قہقہوں کی بہار
گھٹن فضاؤں میں شاید ابھی زیا دہ ہے
وہیں پہ صبح پتنگوں کی لاش پاؤگے
اسی کلی میں جہاں روشنی زیا دہ ہے
خزاں گرآئی تو پہلے اسی کو چن لے گی
وہی جو شاخ شجر پر ہری زیادہ ہے
ابھی محاذ پہ جا نے کی بات مت کر نا
ابھی تمہاری صفوں میں کجی زیا دہ ہے
سبھی لبوں پہ تبسم سجائے ہیں لیکن
جو شہر دل ہے وہاں تیرگی زیادہ ہے

خود غرض دنیا میں آخر کیا کریں
کیا انہیں لو گوں سے سمجھو تا کریں
شہر کے کچھ بت خفا ہیں اس لیے
چاہتے ہیں ہم انہیں سجدہ کریں
چند بگلے کھا رہے ہیں مچھلیاں
جھیل کے بے چارے مالک کیا کریں
تہمتیں آئیں گی نادر شاہ پر !
آپ دلی روز ہی لوٹا کریں
تجربہ اٹیم کا ہم نے کردیا
اہل دنیا اب ہمیں دیکھا کریں



مقدمہ نویسی کے متعلق: چند معروضات

ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری

صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ کملا راجا کرلس پی.جی.کالج

لشکر، گوالیار۔ مدھیہ پردیش۔ موبائل 09827223039

مقدمہ: کسی مرتب کردہ یا مدون کردہ کتاب میں ایک منبع نور (Search Light) کی حیثیت رکھتا ہے۔ مقدمے کے بغیر کسی تدوین شدہ کتاب کا حال ایسا ہے کہ جیسے بغیر آنکھوں کے دنیا کو دیکھنا...!

مقدمہ: راہ نما ہے ، تدوین متن کے راستے میں راہ نمائی کرتا ہے، جس کے سبب کتاب کی تفہیم میں آسانی ہوتی ہے۔ تحقیقی شعور بلند ہوتا ہے۔ تنقید کی راہیں کھلتی ہیں۔ اسی لئے مقدمہ کتاب میں دل و جان کی حیثیت رکھتا ہے۔

ترتیب و تدوین کے سلسلے میں مقدمے کی اہمیت ناگزیر ہے۔ ہر چند کہ مقدمہ مقالہ قلم بند کرنے کے بعد یا متن کو مرتب و مدون کرنے کے بعد تحریر کیا جاتا ہے۔ لیکن ترتیب کے لحاظ سے اسے اولین مقام حاصل ہے۔ مقدمہ چاہے طویل ہو یا مختصر، اس کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ کسی مدون کردہ کتاب کو سمجھنے کے لئے یہ ایک مشعل راہ ثابت ہوتا ہے۔ جس سے فہم و فراست کی راہیں روشن ہوتی ہیں۔ پھر چاہے متن قدیم ہو یا قدیم تر۔ مقدمے کی وجہ سے متن سے متعلق ساری معلومات پہلے پہل سامنے آجاتی ہیں۔ مثلاً

۱) متن کس زمانے کا ہے؟
۲) متن کے کتنے نسخے ہیں؟
۳) نسخوں میں زمانوی فرق کتنا ہے؟
۴) متن کس مقام کا ہے؟
۵) کس نے تحریر کیا ہے؟
۶) متن کا کاتب کون ہے؟
۷) کس رسم الخط میں تحریر ہوا ہے؟
۸) مصنف کے سوانحی حالات کیا تھے؟
۹) مصنف کے دیگر کارنامے کون کون سے ہیں؟
۱۰) متن کا زمانہ اور اس وقت کے سیاسی، سماجی، ثقافتی، تہذیبی اور ادبی حالات کس طرح کے تھے؟
۱۱) مصنف کی ہم عصر مشہور شخصیتیں کون تھیں؟
۱۲) مصنف کے اساتذہ اور تلامذہ کون کون تھے؟
۱۳) دستیاب شدہ نسخوں میں کون سا نسخہ اغلاط والا یا زیادہ اغلاط والا ہے؟
۱۴) کون سا نسخہ بہتر ہے اور کیوں؟ وغیرہ وغیرہ

اس طرح کے اور بھی کئی سوالات کے جوابات مقدمے میں ملتے ہیں۔ یہ مقدمے کی افادیت نہیں تو اور کیا ہے؟ ہم جس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، اس کے بارے میں ہمارے پاس ساری معلومات جمع ہوجائے۔ اس لئے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ متن اگر جسم ہے تو مقدمہ اس کی روح ہے۔

لفظ....؟ مقدمہ عربی زبان کا لفظ ہے، جو لفظ قدم سے بنا ہے۔ اسی سے متعلقہ تقدم، تقدیم، تقدمہ ہے۔ ساتھ ہی قدم کی جمع قدوم اور اقدام بھی ملتی ہے، جن سے مقدمہ یا مقدِمہ کی تکمیل ہوتی ہے۔

مقدمہ یا مقدِمہ دونوں لفظوں کے معنے فیروز اللغات میں اس

طرح درج ہیں۔

۱)مقدِمہ: آگے چلنے والا،آگے جانے والا،فوج کا وہ حصہ جو آگے بھیج دیا جائے۔ ہراول، دیباچہ،تمہید۔

۲)مقدمہ: نالش،دعوے،استغاثہ ،حادثہ،وقوعہ،واردات،واقعہ ،معاملہ،موقع،بات،مسئلہ۔

لغات فرہنگ عامرہ میں مقدِمہ اور مقدمہ کے معنے اس طرح ملتے ہیں۔

۱)مقدِمہ: آگے جانے والا،فوج کا ہراول،کتاب کا دیباچہ۔

۲)مقدمہ: آگے کیا ہوا،واردات،عدالتی کاروائی جمع مقدمات۔

مقدمے کی تعریف:

اردو میں غزل ،قصیدہ ،مثنوی ،رباعی ،داستان ،ڈراما،افسانہ وغیرہ کی طرح مقدمے کی کوئی باضابطہ تعریف نہیں ملتی ہے۔البتہ کچھ اشارے ملتے ہیں، جسے تعریف کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔گیان چندجین نے کتاب 'تحقیق کا فن' میں لکھا ہے کہ

''مقدمہ کتاب کے شروع میں واقع ہوتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ پوری کتاب کی تسوید کے بعد لکھا جاتا ہے''

خلیق انجم نے 'متنی تنقید' میں مقدمے کی تعریف تو نہیں لکھی لیکن مقدمے کے بارے میں اس طرح لکھا ہے:

''متن کے تنقیدی ایڈیشن کے تیار ہونے کے بعد اس کا مقدمہ لکھنا چاہیئے جس میں مندرجہ ذیل پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے

1۔متن کا موضوع ،اس موضوع اور اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں کا اجمالی جائزہ۔

2۔اگر متن سے مصنف یا کسی مشہور شخصیت کے سوانح پر روشنی پڑتی ہو تو اس کا ذکر۔

3۔تنقیدی ایڈیشن تیار کرنے میں جتنے متن استعمال کئے ہیں ۔ان کا اجمالی ذکر۔

4۔ان متنوں کی املا کی خصوصیات۔

5۔اگر ادبی کتاب ہے اور قدیم ہے تو اس کی لسانی خصوصیات''

ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے 'تدوین متن کے مسائل' میں تحریر کیا ہے:

''مقدمہ میں متن کے مرتب کی طرف سے تدوین شدہ نسخے اور اس کے مصنف کے بارے میں ضروری اور ناگزیر نکات کے سوا کچھ بھی پیش کرنا علمی غیر دیانت داری کے ساتھ ساتھ اخلاقی جرم بھی ہے' یا

''مقدمہ وہ ہے جس میں متن کا زمانہ،نسخوں کی تعداد زمانوی فرق ،مصنف کے تفصیلی حالات،ادبی صورت حال وغیرہ کے متعلق جامع معلومات فراہم ہو''

مقدمہ نویسی کی اہم خصوصیات:

۱)نسخوں کی فہرست سازی: مقدمہ نویس کو چاہیئے کہ سب سے پہلے جتنے نسخے دست یاب ہوئے ہیں،ان کی ایک فہرست درج کر دینا ضروری ہے تاکہ نسخوں کا حال پہلے ہی معلوم ہو جائے۔

۲)حاصل شدہ نسخے کی دست یابی کا مقام :نسخوں کی فہرست سازی کے بعد کون سا نسخہ کس جگہ سے فراہم ہوا،اس کی تفصیل لکھنا بے حد ضروری ہے ،تاکہ اس کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ جو نسخہ جس مقام سے دریافت ہوا،اس پر مقامی زبان کا اثر پڑا ہے یا نہیں۔

۳)نسخوں کی شناخت:نسخوں کے برآمد ہونے کے ذکر کے بعد مقدمے میں اس بات کا ذکر ضرور کر دینا چاہیئے کہ کون سا نسخہ معتبر ہے اور اسے کس علامت کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے۔دیگر نسخوں کی علامتیں بھی درج کر دینی چاہیئے ۔مثلاً چار (۴) نسخے ہیں تو'' الف،ب،ج،د'' یا ''۱،۲،۳،۴'' یا شہر کے نام پر اس کے ابتدائی حرف کو درج کر دینا چاہیئے ۔مثلاً اندور، برہان پور،جبل پور،دہلی وغیرہ کے''الف،ب،ج،د۔

۴)نسخوں کا زمانہ: دست یاب شدہ نسخے کس زمانے کے ہیں ،اس کا اظہار کرنا بھی مقدمہ نویس کے فرائض میں شامل ہے۔

۵)رسم الخط/کتابت: دست یاب شدہ متن کس رسم الخط میں تحریر کیا گیا ہے،اس کا ذکر بھی ضروری ہوتا ہے۔مثلاً نسخۂ اول: خطِ نسخ میں

نسخۂ دوم: تعلیق میں، نسخۂ سوم: نستعلیق میں وغیرہ۔

۶) خطاط یا کاتب کی تفصیل: حاصل شدہ متن کی کتابت کس کاتب نے کی ہے۔اس کے بارے میں بھی اگر معلومات ملتی ہو تو مقدمے میں اسے تحریر کر دینا چاہیئے، تاکہ اس کی روشنی میں کاتب کی صلاحیت، اس کی علمی و ادبی استعداد کے مدنظر متن کی اغلاط کا تعین کیا جا سکے۔

۷) نسخوں کا تعارف: مقدمہ نویس کا چاہیئے کہ مقدمے ہی میں سبھی مخطاطات کا تفصیلی تعارف پیش کر دے۔اس کا حجم، لمبائی، چوڑائی، پیمائش، اوراق کی تعداد، روشنائی یا سیاہی، کاغذ کی قسم کا ذکر کیا جانا چاہیئے۔ساتھ ہی نسخہ آب خوردہ، کرم خوردہ ہے، اس کی روئیداد بھی تحریر کر دینا چاہیئے۔اس سلسلے میں اور بھی کئی باتیں بیان کی جا سکتی ہیں۔

اردو میں مقدمہ نویسی کے ابتدائی نقوش اور آثار

کوئی بھی چیز ایک دم یا معاً عالم وجود میں نہیں آتی۔چاہے انسان کی تخلیق ہو یا حیوان کی۔تحریک ہو یا مہم۔زبان ہو یا ادب کی کوئی صنف...ایک عرصے تک اس کا تخلیقی عمل چلتا رہتا ہے۔تب کہیں کوئی شئے عالم وجود میں آتی ہے...! مقدمہ بھی ادب میں یک لخت داخل نہیں ہوا، جس طرح مذکورہ مثالیں۔

مطلب یہ ہوا کہ اردو کے ابتدائی زمانے ہی سے اس کے آثار ملتے ہیں۔یہاں ایک بات قابل غور رہے کہ اگر کسی شاعر یا مصنف نے شاعری یا نثر میں کسی بھی طریقے سے اپنی تخلیق پر اظہار خیال کیا ہے تو وہ مقدمے کے ابتدائی نقوش میں شامل کیا جا سکتا ہے، مثلاً اگر

۱) کسی شاعر یا ادیب نے اپنی تصنیف کی وجوہ بیان کی ہو۔

۲) تصنیف کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی ہو۔

۳) شاعری یا نثر کی طرف توجہ کیوں مائل ہوئی: کا جواب دیا ہو۔

۴) اپنی ہی تصنیف پر تبصرہ کیا ہو۔

۵) اپنی تخلیق کے بارے میں کیا، کیوں، کیسے، کب، کہاں اور کس طرح جیسے سوالات میں سے چند کا جواب دیا ہو۔چاہے وہ غزل یا مثنوی کے اشعار میں ہوں، نظم کے بند میں ہو، یا پھر قصیدے وغیرہ کے اشعار میں ہوں۔مقدمے کے ابتدائی آثار میں اس کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے، مذکوہ قسم کے اثرات اردو ادب کی تقریباً بیش تر اصناف میں پائے جاتے ہیں، جس کا مختصر ترین تذکرہ ذیل میں بیان کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اردو میں مقدمہ نویسی کے آثار کی نشاندہی:

اردو ادب میں زمانۂ قدیم ہی سے مقدمہ نویسی کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔مثلاً ولی نے فارسی نثر میں ایک رسالہ 'نور المعرفت' کے نام سے لکھا۔اس کے دیباچے میں رسالہ لکھنے کی غرض و غایت بیان کی ہے۔ہر چند کہ یہ رسالہ فارسی نثر میں ہے لیکن اس میں مقدمے کے آثار نمایاں ہیں۔ویسے بھی اس زمانے میں فارسی نثر کا غلبہ زیادہ تھا۔

اسی طرح میر نے 'نکات الشعرا' میں تذکرے کے متعلق کچھ مفید مطلب باتیں تحریر کی ہیں۔اس کے علاوہ 'دیوان میر' اور 'ذکر میر' میں بھی مقدمے کی نشانیاں ملتی ہیں۔

اس دور میں مرزا محمد رفیع سودا نے جب اپنا دیوان مرتب کیا تو اس کے دیباچے میں دیوان سے متعلق کچھ ایسے جملے تحریر کئے، جس میں مقدمے کے نقوش پائے جاتے ہیں۔

آئندہ دور میں انشاء اللہ خاں انشاء کے یہاں 'رانی کیتکی کی کہانی' کے ابتدائی صفحات میں اس بات اظہار کیا گیا ہے کہ انہوں نے ایسی نثر لکھی ہے، جس میں عربی، فارسی لفظوں کا استعمال نہیں کیا، اور ہندی بھاکا کا استعمال کیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے یہاں مقدمے کے عناصر موجود ہیں۔

اسی دور میں میر امن نے 'باغ و بہار' میں تصنیف کے متعلق جو عرض داشت بیان کی ہے، اس میں بھی مقدمے کے نقوش صاف دکھائی دیتے ہیں۔

مصحفی نے فارسی تذکرہ 'عقد ثریا' (تذکرہ فارسی گویان) جسے انہوں نے مرزا محمد حسن کے اصرار پر تحریر کیا تھا اور اردو شعراء کا تذکرہ 'تذکرۂ ہندی' میں بھی اپنے فارسی تذکرے کا ذکر کیا ہے۔بعض تصانیف

کے ذکر میں دو(۲) فارسی ،تین (۳) اردو دیوان شامل ہیں ۔ساتھ ہی اس بات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے کہ انہوں نے شاہ عالم کا نسب نامہ تک دو ایک جز شاہ نامے کے بھی تحریر کئے ہیں۔

اسی طرح 'ریاض الفصحا' میں اپنے استاد اور تعلیم کا تذکرہ ملتا ہے،جس میں مقدمے کے اثرات نمایاں ہیں۔

مذکورہ صاحب دیوان اور تذکرہ نگاروں کے علاوہ اور بھی مختلف بیاضوں اور مخطوطات میں ایسی نشانیاں مل جاتی ہیں،جن میں مقدمے کی خصوصیات موجود ہیں۔

ان سب کے علاوہ اگر مجموعی طور پر کسی کی نظم اور نثر میں مقدمے کے آثار گہرے نظر آتے ہیں تو ان میں میرؔ اور غالبؔ کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔دونوں کے یہاں پچاسوں شعر ملتے ہیں،جس میں انہوں نے اپنی شاعری ،وقت ،حالات ،شاعری کا معیار وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔اس کے علاوہ مذہبی عقائد کے آثار بھی نظر آتے ہیں ، جسے ہم مقدمے کے نقوش کہہ سکتے ہیں۔مثال کے طور پر ذیل میں چند شعر درج کئے جارہے ہیں:

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انہیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج وتخت کا

جہاں سے دیکھئے یک شعر شورانگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیواں میں
میر تقی میرؔ

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
غالبؔ

مذکورہ اشعار میں میرؔ و غالبؔ نے اپنے عہد کے حالات اور اپنی زندگی سے وابستہ اہم واقعات کی ترجمانی کی ہے۔شاعری کے علاوہ غالبؔ نے خطوط میں بھی کئی مقامات پر خطوط کی اہمیت ،طرز تحریر ،حالات،اہم واقعات ،حوالے ،تقابلی جائزے ،ہم عصروں کا تذکرہ وغیرہ کا بیان ملتا ہے،جن میں مقدمہ نویسی کی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔مثلاً

''میں نے مراسلے کو مکالمہ بنادیا، ہزار کوس بہ زبان قلم باتیں کیا کرو،ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو'' یا

''لوگ کھانا کھاتے ہیں،میں کپڑا کھاتا ہوں''

ان سب باتوں کے علاوہ ان کے خطوط میں ۱۸۵۷ء کی کہانی غالبؔ کی زبانی خوب تحریر ہوئی ہے۔اگر انہیں باقاعدہ ترتیب دے دیا جائے تو غالبؔ خود ہی اپنے خطوط اور اپنے دور کے بہترین مقدمہ نگار کہلائے جاسکتے ہیں۔

مذکورہ آثار کے اثرات سے ہی اردو ادب میں مقدمہ نگاری کی ابتداء تسلیم کی جاسکتی ہے۔انہیں اولین اقدام پر چل کر مقدمہ اپنی منزل تک پہنچتا ہے۔مذکورہ شواہد کے سبب اردو ادب میں مقدمہ نویسی کا آغاز ہوا اور باقاعدہ مقدمے لکھے جانے لگے۔ذیل میں مقدمہ نویسی کی روایت پر سرسری نگاہ ڈالی جارہی ہے۔

اردو میں مقدمہ نگاری کی روایت کا جائزہ:

اردو ادب میں کسی بھی اصناف پر مدون کردہ کتاب کو سمجھنے،سمجھانے اور اس کی تفہیم کرانے میں مقدمے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔جس سے کتاب کو مدون کرنے والے کی تحقیقی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔اس کے علاوہ مدون کے تنقیدی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔یہی نہیں

بلکہ زیرِ نظر تصنیف کس زمانے اور کن حالات کی پیداوار ہے، پر بھی خاطر خواہ روشنی پڑتی ہے۔

اردو ادب میں مولانا الطاف حسین حالی کے ذریعہ مقدمہ نویسی کا آغاز ہوتا ہے۔انہوں نے جب 'مدوجزر اسلام' تخلیق کی۔ جسے 'مسدس حالی' کہا جاتا ہے۔اس پر ایک مقدمہ لکھا، جو اتنا مشہور ہوا کہ آج اسے 'مقدمہ شعروشاعری' کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس مقدمے کو شاعری کی تحقیق۔اس کی تفہیم اور تنقید میں ایک گراں قدر کارنامہ تسلیم کیا جاتا ہے۔تحقیق، تدوین، ترتیب اور تنقید میں یہ مقدمہ ایسا تاریخ ساز کارنامہ ہے کہ جس سے اردو مقدمے اور اردو تنقید نگاری کا باضابطہ آغاز ہوتا ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی کے بعد مولانا عبدالرحمٰن بجنوری کا نام اردو مقدمے کے ارتقاء میں خصوصیت کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے غالبؔ پر کتاب ''محاسن کلام غالب'' ترتیب دی۔اس کتاب کو ترتیب دینے کے لئے انھیں کافی عرق ریزی کرنی پڑی۔بھوپال کے چکر کاٹے، وہاں سے ''نسخۂ حمیدیہ'' حاصل کیا۔اسی دیوان غالبؔ (نسخۂ حمیدیہ بھوپال) پر جو انھوں نے مقدمہ تحریر کیا تھا، دراصل کتاب 'محاسن کلام غالب' وہی نسخۂ حمیدیہ کا مقدمہ ہے۔اس مقدمے کو اردو ادب میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اگر کوئی غالبؔ پر تحقیقی کام کرنا چاہتا ہے یا غالبؔ فہمی یا غالبؔ شناسی کے سلسلے سے کوئی کتاب لکھنا چاہتا ہے تو کوئی بھی کتاب مذکورہ مقدمے کے بغیر نامکمل مانی جائے گی۔

حالیؔ اور عبدالرحمٰن بجنوری کے بعد اردو مقدمہ نویسی کے میدان میں ایک ایسا شہ سوار سامنے آتا ہے، جس کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا اردو ادب رہا، جس کی وجہ سے انہیں 'بابائے اردو' کے نام سے جانا جاتا ہے۔مولوی عبدالحق کا نام اردو تحقیق میں اظہر من الشمس ہے۔انہوں نے اپنی پوری زندگی کتب خانوں میں رکھے مخطوطات اور کتابوں میں بسر کی۔دور دراز کے مقامات سے سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے سیکڑوں نسخے، مخطوطات، قلمی نوادرات جمع کئے۔ان کے متن کو مدون کر کے اتنے مقدمے لکھے کہ انہیں اردو ادب کا سب سے عظیم مقدمہ نگار کہا جا سکتا ہے۔

حالیؔ، بجنوری اور بابائے اردو کے بعد اردو محققین کی طویل فہرست ہے۔جن میں امتیاز علی خاں عرشی، مسعود حسن رضوی ادیب، مالک رام اور قاضی عبدالودود وغیرہ ان محققین نے جتنی کتابیں مرتب و مدون کی ہیں، ان پر پُر مغز مقدمات تحریر کئے ہیں۔ان مقدمات کی اردو کی علمی، لسانی، تحقیقی، تنقیدی تاریخ میں بڑی اہمیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

درج بالا عظیم مقدمہ نگاروں کے علاوہ سید نجیب اشرف ندوی، ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی، حافظ محمود شیرانی، شمس الرحمٰن فاروقی، عبدالرزاق قریشی، شیخ چاند، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ، ڈاکٹر اکبر الدین صدیقی، ڈاکٹر شیخ فریدؔ، آل احمد سرورؔ، احتشام حسین نے بھی مقدمہ نگاری کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔خصوصاً مسعود حسین خاں اور رشید حسن خاں نے تنقید و تحقیق کے لحاظ سے کچھ ایسے مقدمے تحریر کئے ہیں، جنہیں اردو مقدمہ نگاری میں خصوصیت حاصل ہے۔نیز یہ روایت ترقی کی منزلوں کی جانب گام زن ہے۔

مقدمہ نویسی کا فن:

مقدمے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں نسخوں کی نشاندہی کی جائے، نسخے کی دست یابی کا مقام بتلایا جائے، نسخوں کا زمانہ، رسم الخط اور خطاط کی تفصیل اگر دست یاب ہو سکے تو درج کر دینا چاہیئے۔نسخوں کا تعارف، ایک سے زائد نسخے ہونے کی صورت میں بُعدِ زمانی، نسخوں کی فہرست اور پیمائش وغیرہ کی معلومات فراہم کرانا بھی مقدمہ نگار کی ذمے داری ہوتی ہے۔مصنف کے سوانحی حالات، زمانہ اور اس وقت کی ادبی روایت وغیرہ کا بیان ایک اچھے مقدمے کی ضامن ہیں۔مذکورہ نکات کی عدم موجودگی میں مقدمہ اور فن مقدمہ سے انصاف کیا جانا ممکن نہیں ہے۔

افسانہ

جرمن شیفرڈ



ڈاکٹر مجاہدالاسلام
اسسٹنٹ پروفیسر (اردو) مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
لکھنؤ کیمپس، لکھنؤ۔ موبائل نمبر 7985471308

میرا سامان میری برتھ کے نیچے رکھ کر اب بوڑھا قلی میرے سامنے کھڑا تھا۔ 'صاحب سامان کو ٹھیک سے دیکھ لیجئے، مجھے پیسہ دیجئے ..... ٹرین اب کھلنے ہی والی ہے'۔

گھر سے عین ٹرین کے ٹائم پر نکلنے اور پھر راستے میں جہاں تہاں اٹکتا ٹریفک، جیسے ہی میں نے اسٹیشن پر قدم رکھا، ٹرین چلنے کے لئے تیار تھی۔ ایک طرف دوپہر کی شدید گرمی دوسری طرف ٹرین کے چھوٹ جانے کا اندیشہ۔ میرا بدن پہلے ہی پسینے سے تر بتر تھا۔ اب سر کا پسینہ کمر کے راستے پاؤں تک پہنچ رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن کے نہاں خانے میں رقیہ کا چہرہ کوند گیا۔ رقیہ میری بڑی بیٹی ہے جو اس وقت ماشاء اللہ سٹینڈرفورتھ کی اسٹوڈنٹ ہے۔ چونکہ میری پوری فیملی تین ہی افراد پر مشتمل ہے۔ میں اور میری بیوی ہما اور بیٹی رقیہ، لہذا جب کبھی ہمیں بادل نخواستہ باہر نکلنا ہوتا تو رقیہ بھی ساتھ ہوتی۔ اس دوران جب کبھی بھی ہما اپنی الٹی سیدھی سانس کو درست کرنے کے لئے رقیہ کو مجھے تھماتی تو وہ چاہے چند لمحے کے لئے ہی کیوں نہ ہو؟ رقیہ میری گود میں پیشاب کر دیا کرتی۔ میں اکثر سوچا کرتا ہوں، پتہ نہیں ان دنوں اس کو میری گود سے اتنی بیر کیوں تھی؟۔ پھر فوراً ہی اس کا پیشاب میری شرٹ و پینٹ کو تر بتر کرتا ہوا میرے جوتے میں داخل ہو جاتا، اور جب میں چلتا تو پاؤں اور جوتے آپس میں مل کر آواز پیدا کرتے۔

اپنی برتھ کا حال دیکھ کر مجھے سخت افسوس ہوا۔ برتھ کی ریگزین جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی تھی بلکہ دائیں طرف سے برتھ اندر کو کچھ دھنسی ہوئی بھی تھی۔ دو برتھوں کے بیچ میں اوپر کو شیشہ تو لگا ہوا تھا۔ مگر اس پر گرد و غبار کی تہیں کچھ اس طرح سے جمی ہوئی تھیں کہ صورت بھی اس میں ٹھیک سے نظر نہیں آتی تھی چہ جائے کہ چہرے کے خطوط نظر آتے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سالوں سے اس کو صاف نہیں کیا گیا ہے۔

اس چھوٹے سے کمپارٹمنٹ میں تین سلینگ فین لگے ہوئے تھے جن میں سے ایک ہی چل رہا تھا۔ ایک تو Disconnect بھی تھا۔ ویسے تو موبائل چارج کرنے کے لئے الگ سے پوائنٹ لگا ہوا تھا مگر وہ کام نہیں کر رہا تھا۔ میں نے کئی مسافروں کو دیکھا کہ انہوں نے آناً فاناً اپنے چارجر سوئچ بورڈ (Switchboard) سے لگائے مگر لاحاصل۔

میں اپنی برتھ پر کھڑکی سے لگ کر کچھ اندر کو دھنس کر بیٹھ گیا۔ پورے ڈبے میں ابھی چند ایک ہی مسافر تھے۔ ممکن ہے کسی اور اسٹیشن سے اور مسافروں کو سوار ہونا ہو۔ میرے سامنے والی سیٹ پر البتہ ایک شخص پہلے ہی سے براجمان تھا جو اپنے چہرے مہرے سے سردار اور لباس سے فوجی لگ رہا تھا۔ وہ اپنے چہرے کو سیٹ کے بالکل اپوزٹ گھمائے کچھ کھا رہا تھا۔

ٹرین ابھی بھی اسٹیشن پر ہی کھڑی تھی۔ میں نے جیسے ہی اپنی نظر ذرا اوپر کو اٹھائی ایک خاتون کو اپنے ہی کمپارٹمنٹ میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ایک چار، پانچ سالہ بچہ بھی تھا جو بڑی سختی سے اس کی انگلیوں کو تھامے ہوا تھا۔ عورت کا قد درمیانہ تھا، دیکھنے میں بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ ہو بہو سنگ مرمر کی مورت۔ میں نے بیٹھے ہی بیٹھے اپنی برتھ کی طرف آنکھوں سے اشارہ کر کے، اس کو یہ محسوس کرانے کی کوشش کی کہ یہ جگہ خالی ہے اور یہ کہ وہ یہاں پر بیٹھ سکتی ہے۔ عورت کی جسمانی نزاکت اور سردار کے چہرے کی کثافت مجھے بڑی ہی ان میل سی محسوس ہو رہی تھی۔

اچانک نیچے سے کھڑکی کے پاس منہ کرکے کسی نے اس عورت کو آواز دینی شروع کی۔ پھر وہ فوراً ہی ہاتھوں کے اشارے سے اس سے مخاطب ہوا۔ ادھر بیٹھو ادھر۔ وہ عورت اس کے اشارے پر اس برتھ پر بیٹھ گئی جس پر سردار پہلے ہی سے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ شخص جو کھڑکی کے پاس کھڑا تھا وہ فوجی وردی میں ملبوس تھا جس پر کئی اسٹار ٹنکے ہوئے تھے اس کی پریشانی وفکرمندی سے ایسا لگ رہا تھا یہ شخص ہی اس عورت کا شوہر ہے۔

میرے دل میں ایک لمحے کے لئے خیال گزرا کہ ممکن ہے سردار سے اس شخص کی پہلے سے شناسائی ہو۔ یا پھر فوجی لگی بات ہو۔ ظاہر ہے ایک فوجی عام لوگوں کے مقابلے میں ایک فوجی کے ساتھ ہی زیادہ کمفرٹیبل (Comfortable) محسوس کرے گا۔ میرے ذہن کے پردے پر فوراً فارسی کا وہ محاورہ 'کبوتر با کبوتر باز با باز' کوند گیا۔ میری طالب علمی کے زمانے میں میرے فارسی کے ٹیچر ماسٹر عین الحق اکثر کلاس میں نالائق بچوں کے ایک دوسرے کا ساتھ پکڑ لینے پر یہ محاورہ دہرایا کرتے تھے اگرچہ اس وقت میری استعداد اتنی نہیں تھی کہ میں اس محاورے کا مطلب سمجھ پاتا۔

اس شخص نے باہر کھڑے ہی کھڑے سردار جی کو مخاطب کیا..... پرسوں اس کے بھائی کی منگنی ہے۔ جلدی جلدی میں Date فکس ہوئی ہے اتنی جلدی کہاں ٹکٹ مل پاتا۔ جانا تو مجھے بھی تھا مگر میں چھٹی نہ مل پانے کی وجہ سے نہیں جا پا رہا ہوں۔ سردار جی! تم ہیما کو جھن جھگ اسٹیشن پر اتار دینا، یہ پھپھوند کے بالکل پاس ہی ہے۔ ٹرین وہاں پر بہت کم دیر کے لئے رکتی ہے۔ ٹھیک سے دیکھ لینا ہیما کو کوئی پریشانی نہ ہو۔ منّا بھی ساتھ میں ہے۔

اب وہ عورت بالکل میرے سامنے تھی، میں نظر بچا کر کبھی اس مرد کو نیچے تو کبھی اس عورت کو سامنے دیکھ لیتا تھا۔ عورت کے مقابلے میں مرد کی شخصیت بالکل معمولی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے کوئی مادہ جرمن شیفرڈ کسی انڈین لینڈی کے رابطے میں آ گئی ہو۔

عورت شیفون (chiffon) کی ہلکی گلابی رنگ کی ساڑی پہنے ہوئی تھی۔ بہت حد تک بلاؤز بھی اسی رنگ کا تھا مگر اس میں کچھ کاٹن کی ملاوٹ بھی تھی جس کی وجہ سے بلاؤز دیکھنے میں ساڑی کے مقابلے میں کچھ دبیز سا لگ رہا تھا۔ مگر کوئی خاص سٹائلسٹک (Stylistic) نہیں تھا۔ یا ممکن ہے ایسی کچھ کاریگری بلاؤز کے پشت (Back) پر رہی ہو، جو مجھے سامنے سے نظر نہ آ رہی ہو۔ اس کے پاؤں میں کڑھی ہوئی راجستھانی چپل تھی۔ اگر وہ لمحہ بھر کے لئے بھی اپنے ایک پاؤں کو دوسرے پاؤں کے گھٹنے سے ٹکاتی تو اس کے پیٹی کوٹ کا جھالر نظر آنے لگتا، جس پر سٹیشن پر گھسٹنے کی وجہ سے گرد کی ایک دبیز سی تہ جم گئی تھی۔

وہ آدمی اب بھی کھڑکی کے باہر ہی کھڑا تھا اور اندر ہی اندر بڑا بے چین ہو رہا تھا۔ ممکن ہے وہ عورت پہلی بار اس کے بغیر سفر کر رہی ہو اور اس کو اسے چھوڑنے نہ بن رہا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس لئے کھڑا ہو کہ کہیں عورت اسے یہ طعنہ نہ دے کہ ٹرین چلی بھی نہیں کہ تم سٹک لئے۔ اور اب اس کو اپنی محبت کا اظہار مقصود ہو۔

عورت اپنی جسمانی ساخت اور رنگت سے بہت حد تک منی پوری لگ رہی تھی۔ اس کے برعکس فوجی مغربی یوپی کا لگ رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں اچانک میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ممکن ہے فوجی کی کبھی مشرقی بھارت میں تعیناتی رہی ہو اور وہیں یہ لڑکی اس کے رابطے میں آئی ہو، پھر ان دونوں نے شادی کر لی ہو، مگر اب جب میں نے غور سے دیکھا تو مجھے یہ عورت پورے طور سے مشرقی بھارت کی بھی نہیں لگ رہی تھی۔ اس کی شبیہ ابھی بھی پورے طور سے میرے ذہن میں کلیر نہیں تھی۔ میرے دماغ میں فوراً اصل ونقل کا فلسفہ گھوم گیا۔ میں نے سوچا کہ ہوسکتا ہے کہ اس کے والدین ہی میں سے کوئی ایک مشرقی بھارت کا رہا ہو اور دوسرا مغربی بھارت کا۔ کیوں کہ اس کے اندر کسی نہ کسی حد تک مشرقی ومغربی بھارت کا ایک امتزاج نظر آ رہا تھا۔

میرے تاریخ کے پروفیسر بوچر سنگھ تاج محل، لال قلعہ اور قطب مینار کو مغل، ہند آرٹ کے امتزاج کا حسین نمونہ قرار دیتے تھے۔ مگر میری سمجھ سے ہمیشہ ہی یہ بات پرے رہی کہ وہ اپنے اس جملے میں فنون لطیفہ کی بڑائی بیان کرنا چاہتے تھے یا پھر اس کی تضحیک کرنا چاہتے ہیں۔

البتہ میرا یہ شبہ اس وقت ضرور کچھ یقین میں تبدیل ہوا جب میں نے کہیں پڑھا کہ گھوڑے اور گدھے کے اختلاط سے جو نسل پیدا ہوتی ہے وہ بڑی ہی مضبوط، سڈول اور خوبصورت ہوتی ہے اور غالباً اسی کو عرف عام میں خچر کہا جاتا ہے۔

مجھے اب اس بات میں بھی کوئی تذبذب نہیں رہا کہ جغرافیہ

کے دوا کر سر جاڑے کی کپکپاتی صبح میں کمپنی باغ میں اپنی دیہاتی کتیا کو لے کر مس بالٹی والا کے بدیشی کتے کا کیوں انتظار کرتے ہیں؟

مجھے بڑا تعجب ہوا کہ ایک بچہ پیدا ہو جانے کے باوجود ابھی بھی عورت کے جسم کا ہر بند کمان پر لگے تانت کی ٹائٹ تھا۔ جب بھی اس کا آنچل دم بھر کے لئے بھی سرک جاتا تو اس کا کسی بھی طرح کے داغ دھبے سے بے نیاز صاف شفاف پیٹ کندن کی طرح دمک اٹھتا۔

پتہ نہیں کیوں اچانک میرے کان میں نھوا نانبائی کی آواز گونجنے لگی۔ نھوا روٹیاں بنا کر تھوک کے بھاؤ سے ہوٹلوں میں سپلائی کرتا ہے۔ میرے یہاں اگر کبھی معمول سے زیادہ مہمان آجاتے تو سالن تو گھر میں ہی بن جاتا ہے مگر روٹی نھوا نانبائی کے یہاں سے ہی آتی ہے۔ ایک مرتبہ جب میں نھوا کے یہاں پہنچا تو اس کو معمول کے برخلاف دن نکلتے تک آٹا گوندھتے ہوئے پایا، میرے یہ کہنے پر کہ آج بہت ٹائم لگ رہا ہے.....کیا بات ہے؟ وہ بولا صاحب! 'نئے گیہوں کا آٹا ہے، ابھی ٹھیک سے تار نہیں ٹوٹا ہے'۔

میں ابھی انہی خیالوں میں گم تھا کہ اچانک ٹرین رینگنے لگی اور پھر اس نے کب رفتار پکڑ لی مجھے خبر تک نہیں ہوئی۔ ٹرین اب ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ لوگ اپنی اپنی سیٹوں پر سنبھل کر بیٹھ چکے تھے۔

اچانک میرے موبائل کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف میری بیوی ہما تھی۔

'آج تو تم دو برتھوں کا مزہ لے رہے ہوگے؟'۔

مجھے غصہ آگیا۔ میں نے اسے ترکی بہ ترکی جواب دیا:

'ہاں کیوں نہیں تم نے موقع جو دیا ہے'۔

'مگر میرے حصے کی برتھ پر کسی لڑکی وڑکی کو مت لٹانا'۔

'ہاں! یہ تو وقت ہی بتائے گا'۔ میں نے فوراً جواب دیا۔

'ظاہر ہے میں وہاں پر تو ہوں نہیں؟ مگر تم نے اگر ایسا کچھ بھی کیا تو میری روح کو ضرور تکلیف پہچاؤ گے'۔

ہما! 'اصل میں تم ہو ہی بڑی نوٹنگی باز۔ مجھے کہیں بھی جانا ہو تو تم میرا اس لئے ساتھ پکڑتی ہو کہ میں تمہیں کہیں سیر و تفریح کے لئے نہیں لے جاتا، مگر جب جانے کا وقت آتا ہے تو صاف مکر جاتی ہو'۔

'آپ کی طرح میں پتھر دل تھوڑے ہی ہوں۔ میری جب بچوں کے چہروں پر نظر پڑتی ہے تو میرا دل کانپ اٹھتا ہے کہ ان کو چھوڑ کر کیسے کہیں جاؤں؟۔ میں ان کی ماں ہوں، ماں کا مطلب بھی آپ سمجھتے ہیں؟'

میں نے کہا: 'اگر ایسا ہی ہے تو تم آرام سے گھر پر بیٹھو۔ پھر اس طرح کی باتیں ہی کیوں کرتی ہو؟'۔

ہما کی اس طرح کی حرکتوں سے میں ہمیشہ ہی بڑے مخمصے میں پڑ جاتا ہوں۔ اس مرتبہ بھی قریب قریب ایسا ہی ہوا۔ اس کے انکار پر جب میں آخری دن اس کا ٹکٹ کینسل کرانے کے لئے بکنگ آفس پہنچا تو ٹکٹ ہی کینسل نہیں ہوا۔ ونڈو پر ایک ادھیڑ عمر کی کھوسٹ سی بڑھیا بیٹھی ہوئی تھی، کہنے لگی ٹکٹ ایک ساتھ ہے۔ پہلے دونوں ٹکٹوں کو کینسل کراؤ۔ پھر دیکھیں گے تمہارا ٹکٹ بک ہو بھی پاتا ہے یا نہیں؟۔ ایسی صورت میں کبھی ٹکٹ بک ہو بھی جاتا ہے اور کبھی نہیں بھی۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔ میں بڑبڑانے لگا، یہ سالے ریلوے والے بھی بڑے عجیب ہیں۔ آئے دن نئے نئے قانون بناتے رہتے ہیں۔ اور یہ سالا ڈبے کے اندر تو سہولت کے نام پر خاک اڑ رہی ہے۔

ایک لمحے کے لئے میرے دل میں گمان گزرا ممکن ہے یہ بڑھیا کام ہی نہیں کرنا چاہ رہی ہو۔ جب تک عورت کنواری ہوتی ہے سدا بہار ہوتی ہے۔ کیا اتر اور دکھن.... ہر طرف کا دروازہ کھول کر رکھتی ہے اور جیسے ہی شادی ہوئی، بچہ ہوا، فوراً ہی برتاؤ میں تبدیلی آجاتی ہے۔ پھر اس کو شوہر، بچے اور اپنی گھر گرہستی کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آتا ہے .....رہے یہ سالے ٹکٹ چیکر تو طرح طرح کے سوال کریں گے۔ کون ہے وہ؟ اگر اس کو نہ جانا تھا پھر ٹکٹ ہی کیوں لیا؟۔ کیا کچھ دال میں کالا تو نہیں ہے؟۔

ابھی میں کال مکمل کر کے بیٹھا ہی تھا کہ اچانک مجھے اپنے ڈبے میں ایک ہل چل سی محسوس ہوئی۔ اسی دوران سردار جی کی برتھ پر بیٹھی ہوئی وہ عورت جو اب تک ہما سے میری ہو رہی گفتگو کو بغور سن رہی تھی، اب ٹھیک میرے بغل میں آکر بیٹھ گئی۔ اور میرے بغیر کسی استفسار کے وہ خود ہی کہنے لگی۔ میں ایسٹرن یوپی کی رہنے والی ہوں۔ میری ماں منی پوری تھی، میرے باپ فوجی تھے، ان کی تعیناتی مشرقی بھارت میں تھی۔ ویسے وہ رہنے والے مشرقی یوپی کے ہی تھے۔ میرے نانا بڑے ہی مفلوک الحال قسم کے آدمی تھے۔ میرے باپ فوجیوں کے کھانے کے

سامان میں سے کچھ چرا، چھپا کر ان کی مدد کر دیا کرتے تھے۔ اسی میل جول میں ان کو میری ماں سے محبت ہوگئی۔ اور پھر یہ اتنی بڑھی کہ شادی کی نوبت آ گئی۔ میرے نانا بالکل نہیں چاہتے تھے کہ یہ شادی ہو، میری ماں چار بھائیوں کی واحد بہن تھی۔ نانا کی بڑی دلاری تھیں، وہ نہیں چاہتے تھے کہ اتنی دور جائے۔

میں نند کی منگنی میں جھن جھگ جا رہی ہوں۔ پہلے سے جانے کا میرا ارادہ بالکل نہیں تھا اچانک ہی پروگرام بنا ہے۔

ہیما جب تک بڑبڑاتی رہی، میں اندر ہی اندر کہیں نہ کہیں یہ سوچنے پر مجبور ہوتا رہا کہ کیا انسان واقعی اپنی ذات، مذہب اور فرقے کے مقابلے میں دوسری ذات، مذہب اور فرقے کے لوگوں میں جنسی لحاظ سے زیادہ کشش محسوس کرتا ہے؟۔ کہا جاتا ہے کہ تقسیم ہند کے فوراً بعد دہلی کی اکثر طوائفوں نے اپنا نام تبدیل کر کے نجمہ، سلطانہ اور ریحانہ کر لیا تھا۔

اچانک میں نے کئی ٹکٹ چیکروں کو پولیس والوں کے ساتھ اپنے ڈبے میں داخل ہوتے دیکھا۔ ہیما گھبرا سی گئی۔ اس کے پاس سلیپر کا ٹکٹ نہیں تھا۔ وہ میرے اور قریب آ گئی۔

'مجھے پتہ ہے آپ کے پاس دو ٹکٹ ہے۔ کیا آپ مجھے ایڈجسٹ نہیں کر سکتے'؟

'یہ کیسے ممکن ہے'؟

'کیا آپ کی بیوی مجھ سے زیادہ عمر کی ہیں'؟

'نہیں.....!'

'ایسا کچھ بھی نہیں ہے'

'تو پھر.....؟'

'ہما اور ہیما میں فرق ہی کیا ہے'؟

'ہاں یہ تو ٹھیک ہے پر تمہاری مانگ میں سندور، ماتھے پر بندیا اور گلے میں منگل سوتر ہے اور میں ٹھہرا مسلمان..... میں جھوٹ بول کر مصیبت میں پڑ سکتا ہوں'؟

'نہیں.....نہیں! میں ایسا بالکل نہیں کر سکتا ہوں.....'

'کیا ہم آپس میں دوست بھی نہیں ہو سکتے'؟

ہیما کا یہ جملہ سن کر میں اندر سے کچھ پگھل سا گیا۔ میں نے فوراً ہی سوچا کہ اگر ٹکٹ چیکر نے زیادہ پوچھا تو کہہ دیں گے یہ میری ہی کالونی میں رہتی ہے اور بچپن میں ہم دونوں دہلی کے ایک کالج میں کلاس فیلو بھی تھے۔ ہیما نے میری خاموشی کو میری رضا سمجھا اور اس نے فوراً ہی میرا نام پوچھا اور جھٹ سے میری ہی جیب سے میرا قلم نکال کر اپنی ہتھیلی پر لکھ لیا۔ اس کی نرم و گداز گوری گوری ہتھیلیوں پر مائل بہ سیاہ مہندی منقش تھی۔ جواب پسینے کی وجہ سے کچھ پسیجی ہوئی تھی۔

ہیما نے اب اپنے بچے کو دائیں سائڈ سے ہٹا کر بائیں سائڈ میں بٹھا لیا اور پھر اس نے فوراً ہی اپنے کندھے، کمر اور کولہے کو کچھ اس طرح سے میرے، کندھے، کمر اور کولہے سے پیوست کر دیا۔ میری کنپٹیاں گرم ہونے لگیں.....چند ہی ثانیے مجھے اپنا پہلو پسینے سے تر بتر ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

اچانک وہ مخاطب ہوئی اور آپ کا موبائل نمبر؟ میں نے اپنا موبائل نمبر بھی اسے بتا دیا، جب میں اپنا نام بتانے لگا تو اس نے بڑی ہی معصومیت سے اپنی ہتھیلی مجھے دکھائی، جس پر پہلے ہی سے میرا نام کنندہ تھا، جواب بڑی ہی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

اچانک ٹکٹ چیکر میرے قریب آ گیا میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کو ٹکٹ دیا، پہلے تو اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی، پھر دوسری ہیما پر جو اب پوری طرح سے مجھ سے چپکی ہوئی تھی۔ جب ٹکٹ چیکر وہاں سے چلا گیا تو ہیما ذرا ڈھیلی پڑی.....میری جان میں جان آئی اور اب میں نے کھل کر سانس لی۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر ایسی پوزیشن میں ہما مجھے دیکھ لیتی تو کیا کہتی۔ ہما تو ویسے بھی اگر میں سیکنڈ بھر کے لئے کسی عورت کی طرف نظر اٹھاؤں تو یہی کہتی ہے کہ تم مردوں اور کتوں میں ذرا بھی فرق نہیں ہے۔ کتے کو جیسے ہی چھیچھڑا نظر آیا منہ سے رال ٹپکی.....تم نالی کے کیڑے! رانی اور مہترانی کے فرق کو کیا جانو؟۔

ٹرین پوری رفتار کے ساتھ چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں کو چھوڑتی ہوئی فراٹے بھر رہی تھی جن لوگوں نے کھانے بک کروائے تھے ان کے کھانے ان کی برتھوں ہی پر آ گئے تھے، جن سے اب وہ لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اچانک میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہی ٹکٹ چیکر جو کچھ دیر پہلے ہمارے ڈبے کو چیک کر کے گیا تھا، پھر ہمارے ڈبے میں آ گیا اور عین

ہمارے سامنے سائڈ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں کچھ گھبرا سا گیا۔.....میں نے دیکھا کہ اس نے لوگوں سے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں جس میں خاص طور سے ملک کی تازہ ترین صورت حال تھی۔ ہیما بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔ مجھے بڑی گھبراہٹ ہو رہی تھی، نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے بھی ان کی باتوں میں حصہ لینا پڑ رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کہ ڈبے میں ٹکٹ چیکر کی نظریں کچھ اور ہی تلاش کر رہی ہوں۔ ہیما جو چیکنگ کے بعد اب مجھ سے کچھ الگ ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ میں نے زبردستی اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اس کو پوری قوت سے اپنی طرف کھینچا اس کا کولہا میری ران سے ٹکرایا....وہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں لال ڈورے کھنچ گئے۔

ہیما کے بچے نے پورے ڈبے میں ادھم مچا رکھا تھا۔ اب چیکر بھی اس سے کھیلنے لگا۔ طرح طرح کے وہ اس سے سوالات کر رہا تھا ....مجھے اپنے بارے میں صاف خطرہ محسوس ہو رہا تھا..... اس کی عینک اس کی ناک کے آخری سرے پر ٹکی ہوئی تھی، اس کی پلکیں منٹوں میں جھپکتی تھی، مجھے وہ بڑا خطرناک لگ رہا تھا۔ سالا اب میں مرا....کہیں وہ جان نہ جائے کہ میں مسلمان ہوں۔

پچھلے دنوں جب میں اسی ٹرین سے سفر کر رہا تھا تو ایک اسٹیشن پر میں چائے پینے کے لئے نیچے اترا، ابھی میں نے چائے ختم بھی نہیں کی تھی کہ اچانک ٹرین چل پڑی۔ میں ایک سامنے والے ہی کمپارٹمنٹ میں گھس گیا۔ مجھے وہاں پر ایک ایسا شخص نظر آیا جسکی داڑھی لمبی اور سر پر گول ٹوپی تھی۔ عمر اس کی لگ بھگ 60/65 کے بیچ میں رہی ہوگی۔ اس کے بغل میں ٹھیک اسی کی عمر کی ایک بڑھیا بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ بادی النظر میں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کہ یہ لوگ آپس میں میاں بیوی ہوں۔

دہلی سے جیسے ہی ٹرین چلی، مجسٹریٹ چیکنگ کا ایک غلغلہ سا پورے ڈبے میں پھیل گیا۔ لوگ سنبھل کر اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ پھر میں نے دیکھا کہ ٹکٹ چیکروں کے چھنڈ کے چھنڈ ڈبوں میں منڈلانے لگے۔ اس ڈبے میں بھی کئی ٹکٹ چیکر آئے۔ پہلے تو انہوں نے اس بڈھے سے اس کا ٹکٹ مانگا۔ پھر وہ فوراً ہی اس سے مخاطب ہوئے کہ تمہارا دوسرا آدمی کون ہے؟۔ اس نے فوراً ہی اس بڈھی کی طرف اشارہ کیا۔ پہلے تو ٹکٹ چیکروں نے اس بڈھے کو جم کر گالیاں دیں پھر بولا تم مسلمان اور یہ ہندو پھر میاں بیوی کیسے ہوئے؟ پھر اس نے بڈھے کے گلے میں ہاتھ ڈال کر زور زور سے اسے جھنجھوڑا۔ بڈھی کی الگ درگت کی۔ بڑی مشکل سے ان دونوں نے چیکروں سے معافی مانگ کر جان بچائی۔

جیسے جیسے ٹرین آگے بڑھتی جا رہی تھی میرا دل طرح طرح کے خدشات کی آماجگاہ بنتا جا رہا تھا۔ مجھے اپنی حرکت پر پچھتاوا ہو رہا تھا ....میں ہیما سے انکار بھی تو کر سکتا تھا؟۔ یہ تو سراسر فراڈ ہے۔ عزت و آبرو کی بات تو دور رہی جیل بھی تو ہو سکتی ہے؟۔ نوکری بھی جا سکتی ہے؟

میری ماں کو سرکاری نوکری کی کتنی لالسا تھی۔ کچھ بھی ہو۔ مگر آصف کو سرکاری نوکری مل جائے بس یہی اس کی آخری رٹ تھی۔ اس نے رشوت دینے کے لئے اپنے کان کے بندے تک اتار کر مجھے دے دیے۔ جس وقت میں ان کو سنار کے حوالے کر رہا تھا، میں ماں کے کانوں کی مل گجی بو کو بخوبی محسوس کر سکتا تھا۔ بڑی مشکل ہی سے مجھے یہ نوکری ملی تھی۔

اسی شش و پنج میں اچانک پھپھوند آ گیا۔ کسی نے نیچے سے ٹکٹ چیکر کو آواز دی وہ فوراً ہی اس آواز کے پیچھے بھاگا۔ ٹرین اب پھر دوبارہ اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ میری جان میں جان آئی، کیوں کہ اب چیکر کے جھن جھگ تک اس ڈبے میں آنے کا دور دور تک کوئی امکان نہیں تھا۔ ہیما اب ٹرین سے اترنے کے لئے تیار تھی سردار جی نے اس کے اٹیچی کیس کو پہلے ہی برتھ کے نیچے سے نکال لیا تھا۔ ہیما اب اپنے چہرے مہرے کو اپنے ہاتھوں سے درست کر رہی تھی۔ اس کی ہتھیلی میں اب بھی میرا نام ٹمٹما رہا تھا۔ جھن جھگ آ چکا تھا۔ ہیما بڑی ہی بددلی سے اپنے ناخونوں کی مدد سے میرے نام کو اپنی ہتھیلی سے کھرچتی ہوئی ٹرین سے نیچے اتر گئی۔ (ختم شد)

افسانہ

اچھے دن



ڈاکٹر سلیم احمد

544C/168، الماس باغ، ہردوئی روڈ، لکھنؤ

موبائل 9415693119

گاؤں کے باہر ایک پرانا پیپل کا درخت تھا جس پر ایک گدھ کا جوڑا برسوں سے قیام کر رہا تھا ادھر کچھ دنوں سے گدھ کے بچے اپنے گھونسلے سے نکل کر پیڑ کی شاخوں پر نظر آ رہے تھے۔ اکثر دیکھا جاتا تھا کہ گدھ گوشت کے ٹکڑے لاتا اور بچوں کے منھ میں رکھ کر چلا جاتا یہ سلسلہ کئی روز سے یوں ہی چلتا رہا۔

جب نر گدھ کھانے کی تلاش میں چلا جاتا تو مادہ اپنے بچوں کو آغوش میں لیکر اپنی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کو کہانی کی شکل میں بچوں کو سناتی۔ ایک روز اس نے بچوں کو بتایا کہ ملک کی تقسیم کے بعد ہوا بچوں سے لیکر بوڑھوں تک کی لاشوں کے انبار لگے تھے۔ چاروں طرف گوشت کی فراوانی تھی۔ آج کھا کر ختم کرو دوسرے دن پھر لاشیں موجود رہتیں۔ پاسپورٹ کا کوئی چکر نہیں تھا اس لیے سرحد کے اس پار بھی ہم لوگ گوشت کھا کر چلے آتے۔ دونوں طرف انسانی لاش ہی لاش تھی۔ کہیں بھی کھاؤ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہاں! سرحد کے اس پار کے لوگوں کے زیادہ تر گوشت کی لذت اچھی ہوتی کیونکہ سرحد کے اس پار جانے والوں میں امراء اور زمین داروں کی تعداد زیادہ تھی، کھاتے پیتے لوگ تھے، جسم فربہ تھا کھانے میں مزا آجاتا۔ پھر بھی ہندو ہو یا مسلمان دونوں کے گوشت کی لذت یکساں تھی۔ خدا سلامت رکھے ہمارے رہنماؤں کو۔

رہنماؤ کو کیوں سلامت رکھے؟

انسانی گوشت سے ان کا کیا رشتہ؟ گدھ کا ایک بچہ ماں سے سوال کر بیٹھا۔

ہاں بیٹا! بہت بڑا رشتہ ہے یہی تو سبب ہوتے ہیں ہمارے کھانے کے انتظام کا۔ جب تک ان کے اندر بے حسی قائم ہے ہم لوگ مزے لیتے رہیں گے۔ جس دن یہ حساس ہو جائیں گے ہم لوگ انسانی گوشت کیلئے ترس جائیں گے۔

بچے ماں کی کہانی کو سنتے اور درمیان نے سوال بھی کرتے رہتے۔

گدھ کے بچے مرے ہوئے مختلف جانوروں کا گوشت کھاتے کھاتے اوب چکے تھے۔ ایک روز بچوں نے اپنے باپ سے فرمائش کی کہ جانوروں کا گوشت کھاتے کھاتے انکی طبیعت سیراب ہو چکی ہے۔ ماں نے بتایا ہے کہ انسان کے گوشت میں زیادہ لذت ہوتی ہے۔ آج ہم لوگوں کو انسان کا گوشت چاہئے اس پر مادہ گدھ نے بچوں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا کہ انسان کا گوشت کھائے ہوئے ہمیں بھی کافی دن ہو گئے کیا دن تھے جب گجرات میں انسان کا گوشت کھاتے کھاتے تھک گئے مگر گوشت تھا کی کمبخت ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا، کتنا لذیذ تھا معصوموں اور بے گناہ انسانوں کا گوشت۔

بچے ماں کی بات سن کر مچل پڑے اور باپ سے ضد کرنے لگے کہ آج تو ہم لوگ صرف انسان کا ہی گوشت کھائیں گے ہمیں انسانی گوشت کھائے کافی دن ہو گئے۔ آج ہم لوگ انسانی گوشت کی لذت لیں گے۔ ورنہ آج سے کھانا-پینا بند۔

گدھ انسان کے گوشت کی تلاش میں نکل پڑا۔ پورا دن وہ آسمان میں چکر لگاتا رہا مگر اسے کہیں انسان کی لاش نہیں ملی مایوس ہو کر گدھ اپنے گھونسلے کی طرف لوٹ پڑا تبھی اسے راستے میں ایک مری ہوئی گائے نظر آئی جس کو بہت سے گدھ تھے۔ وہ بھی اپنے بچوں کے لیے گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا لیکر تیزی سے پرواز کر گیا مگر بچوں نے گوشت کھانے سے انکار کر دیا وہ صرف انسان کا گوشت کھانے کی ضد کرتے رہے۔ گدھ پس و پیش میں پڑ گیا کہ کہاں سے انسان کا گوشت لائے مجبوراً دوسرے دن بھی وہ بچوں کی فرمائش پوری کرنے کے لیے چاروں طرف گھومتا رہا مگر انسان کی لاش کہیں بھی نہیں ملی۔ سورج بھی دن کا سفر پورا کر غروب ہونے لگا مگر بچوں کے کھانے کی فرمائش ابھی تک پوری نہیں ہو سکی تھی کہ ایک جگہ ایک سور مرا ہوا ملا جس کی جان ابھی جلد ہی نکلی تھی اس نے اس میں سے ایک ٹکڑا لیا، گھونسلے پہنچا، بچوں کو پیار سے کھلانے لگا مگر بچے اب بھی پوری طرح ضد پر قایم تھے۔ ان سبھی نے سور کا گوشت کھانے سے انکار کر دیا مادہ گدھ کی ممتا جاگ اٹھی اس سے اپنے بچوں

کی یہ حالت دیکھی نہیں جارہی تھی جو دو روز سے بھوکے تھے۔

کیوں! بڑے نر بنتے ہو۔۔۔۔۔بچوں نے ایک چھوٹی سی کھانے کی فرمائش کی تھی جسے دو دن میں پوری نہیں کر سکے، اتنی بڑی دنیا ہے تلاش کرتے تو کہیں نہ کہیں کامیابی مل ہی جاتی۔لعنت ہے ایسے نر کہلانے پر۔۔۔۔مادہ گدھ مسلسل بولے جارہی تھی۔

ارے میں کہاں سے لاؤں؟ کیا عراق چلا جاؤں، لیبیا چلا جاؤں یا پھر یمن یا شام چلا جاؤں۔اپنے ملک میں جب کوئی لاش ملی ہی نہیں تو میں کیا کروں، کہاں سے لاؤں انسانی گوشت ؟ نر گدھ نے کہا۔

نہیں۔نہیں! سیریا، فلسطین اور مصر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔کیا پڑوس میں پاکستان اور افغانستان نہیں ہیں؟ کہ سات سمندر پار جاؤ گے ۔ارے وہاں بھی تو آسانی سے انسانی گوشت مل جاتا ہے اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ اپنے ملک میں ہی مل جائے۔مادہ گدھ نے کہا۔

اپنے ملک میں؟

ہاں۔۔۔۔ہاں اپنے ملک میں۔

پر کہاں؟

وہی جسے ہم دنیا کی جنت کہتے ہیں۔

جنت نشاں سے تمھاری مراد کہیں کشمیر تو نہیں۔نر گدھ نے کہا۔

ہاں۔ہاں میں کشمیر ہی کی بات کر رہی ہوں۔

تلاش کرو تو کیا نہیں ملتا۔جب خدا مل سکتا ہے تو یہ تو انسانی گوشت ہے لیکن تم ہو کہ گھوم پھر کر یہیں رہو گے بھلے بچے بھوکے مر جائیں۔۔۔۔مادہ گدھ نے کہا

اس میں غلطی تمہاری ہی ہے تم نے جب سے مظفر نگر میں نسل کشی کے دوران میرے بچوں کو انسانی گوشت کا مزا چکھایا ہے تب سے یہ بچے انسانی گوشت کے دلدادہ ہو گئے ہیں۔ارے میں تو کہتی ہوں کہ اب یہاں سے کشمیر ہی کیوں نہ ہجرت کر لی جائے۔کم سے کم بچوں کو روز انسانی گوشت تو مل جائے گا اور ہم لوگوں کی بھی خوراک پوری ہوتی رہے گی۔مادہ گدھ نے کہا۔

نہیں۔بالکل نہیں۔اس میں میری غلطی نہیں، بلکہ یہ تو میرے خون میں ہے۔گرچہ میرے باپ ہاشم پورہ اور ملیانا میں انسانی گوشت سے لطف اندوز ہوئے اور ہمیں بھی کرایا تو میرے دادا جان نے مرادآباد میں خوب انسانی گوشت۔۔۔۔۔وہ اپنی بات پوری کیئے بغیر تیزی سے آسمان میں ایک جانب پرواز کر گیا۔

صبح کا وقت تھا کوئی نماز تو کوئی پوجا کی تھال لئے مندر کو جا رہا تھا۔گدھ نے شہر سے ماہر کھیت میں ایک مرے ہوئے جانور کے گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا مندر کو جانے والے راستے پر گرا دیا اور دور ایک پیڑ پر بیٹھ کر تازہ انسانی گوشت کا انتظار کرنے لگا۔

مندر کو جانے والے لوگ راستے میں پڑے گوشت کو دیکھ کر آپس میں کانا پوسی کر رہے تھے کہ تبھی کسی کی آواز آئی ارے ہو نہ ہو یہ تو گئو ماتا کا مانس ہے اور پھر.....دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں کی تعداد میں گائے کو ماتا کہنے والوں کا مجمع لگ گیا، افواہ تیزی سے پھیلنے لگی اور شر پسند عناصر سرگرم ہو گئے۔

گدھ کو پورا یقین تھا کہ آج اس کے بچے بھوکے نہیں سوئیں گے بلکہ قرب و جوار کے تمام گدھوں کے لئے بھی کئی روز کی خوراک کا انتظام ہو جائے گا۔

تمام طرح کی افواہوں میں اقلیتوں نے گئو ماتا کی ہتیا کر دی، نے زور پکڑ لیا۔یہ ایک ایسی افواہ تھی جو پرسکون ماحول کو پراگندہ کرنے کے لئے کافی تھی۔

ابھی علاقے کے معزز اور معتبر افراد اس افواہ پر لوگوں سے توجہ نہ دینے کی اپیل کر ہی رہے تھے کہ زعفرانی شر پسندوں کا ایک ہجوم ہر ہر مہادیو ،جے شری رام کے نعرے لگاتا ہوا مظلوموں کے محلوں میں داخل ہو گیا۔گوشت گئو ماتا کا ہے، بھینس کا ہے، بکرے کا ہے یا کسی دیگر جانور کا اس سے کسی کو کوئی سروکار نہیں تھا۔سروکار تھا تو بس گوشت کا ملنا اور اس پر گائے کے نام کا ٹھپہ لگ جانا ہی کافی تھا۔

لمحہ بھر کے اندر شعلوں کی لپٹوں، عورتوں اور بچوں کی آہ و بکا، ہر ہر مہادیو اور جے شری رام کے ساتھ اللہ اکبر کے ملے جلے نعرے، نالیوں کے لال ہوتے پانی، سڑکوں پر تڑپتی لاشیں اور دھماکوں کی آواز، کسی کے ہاتھ میں تلوار تو کسی کے ہاتھ میں ترشول لئے انسانی گدھوں نے کئی دنوں کی خوراک کا انتظام پل بھر میں کر دیا تھا۔شام ہوتے ہوتے انسانوں کی لاشیں جگہ جگہ بکھری پڑی تھیں۔گدھ خوشی سے جھوم اٹھا اس نے مادہ گدھ اور بچوں کو انسانی گوشت کی ضیافت سے شکم سیر کر دیا۔

نر گدھ نے اپنے بچوں کو نصیحت دیتے ہوئے کہا کہ بچو! آج میں ایک سبق آموز نصیحت دے رہا ہوں۔یہ تمہارے کام آئے گی۔

دیکھو ! ہماری نسل تیزی سے معدوم ہو رہی ہے اور اب ہماری جگہ انسانی گدھوں نے لے لی ہے۔ہمیں انسانی گدھوں سے اقتدار واپس لینا ہوگا اور اپنی نسل کو بچانا ہوگا تبھی 'اچھے دن' آئیں گے۔

◆◆◆

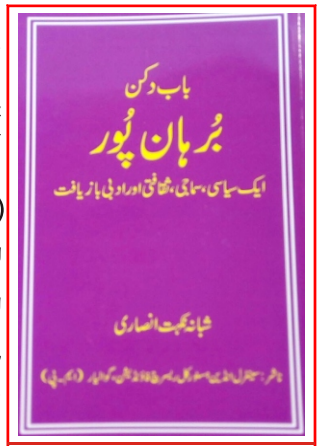
علاقائی ادب کی تحقیق پر ''باب دکن برہان پور: ایک سیاسی، سماجی، ثقافتی اور ادبی بازیافت'' اپنے موضوع اور نوعیت کے لحاظ سے بہترین تحقیقی تصنیف ہے۔ جس طرح رسائل و جرائد میں خصوصی شمارے یا نمبر بڑی اہمیت اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، اسی طرح علاقائی ادبی تحقیق میں خصوصیت کے مدنظر یہ تحقیقی کتاب اپنی نوعیت، اولیت اور موضوعاتی انفرادیت کے سبب اہمیت کی حامل ہے۔ اس سے سماج اور خصوصاً ادبی سماج مستفیض ہو سکے گا۔

مقالے کی حیثیت تاریخی بھی ہے۔ چنان چہ اس مخصوص خوبی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ علاقائی تحقیق میں منہمک کوئی شخص برہان پور کی سیاسی، سماجی، ثقافتی اور ادبی تاریخ اور مذکورہ صورت حال کی تفتیش و دریافت کے مقصد سے کتاب کا مطالعہ کرنا چاہے تو اسے مختلف ادوار کی تاریخ اور اس سے وابستہ ضروری اور اہم معلومات فراہم ہو سکے گی۔ مصنفہ شبانہ نکہت انصاری نے اختصار میں خوبی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ گویا برہان پور کی سیاسی، سماجی، ثقافتی اور ادبی تاریخ کے نشیب و فراز، اس کی ترقی و توسیع نیز مذکورہ تواریخ کے سفر کا عہد بہ عہد منظر نامہ کتاب کے مختلف ابواب میں بڑی خوب صورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح اس کتاب کا تاریخ سے اور تاریخ کا سماج سے گہرا رشتہ ہے۔

کتاب کا مقصد علاقائی تحقیق اور اس سے وابستہ مخصوص سلسلۂ شعری سے ہے۔ بڑی تلاش، دریافت، چھان بین اور تحقیق کے بعد مصنفہ نے اس مقالے میں علاقائی شعراء کا عمومی اور سلسلۂ میر تقی میرؔ کے شعراء کا خصوصی تذکرہ بڑے انہماک کے ساتھ کیا گیا ہے۔ لیکن کہیں کہیں اختصار کھٹکنے لگتا ہے۔ اس طرح ایک مقام پر مذکورہ شعراء کا مطالعہ اہل تحقیق کے لئے باعث تسکین اور لائق اطمینان ہوگا۔ وہیں سماج کا ہر ادبی فرد اس کے مطالعے سے محظوظ ہوگا۔

زیر نظر کتاب قوس قزح کی نوعیت لئے زندگی، سماج اور ادب کے گوشہ ہائے گونا گوں سے وابستہ ہے۔ شاعری کا سماج سے، سماج کا تہذیب سے، تہذیب کا ثقافت سے، ثقافت کا تاریخ سے، تاریخ کا تحقیق سے، تحقیق کا تنقید سے اور تنقید کا تخلیق سے گہرا ربط وضبط ہے۔ یہ سب ایک دوسرے سے باہمی روابط رکھتے ہیں۔ اس طرح اس کتاب کی نوعیت تحقیقی، تنقیدی، ادبی، سماجی اور تاریخی ہے۔ چنان چہ ادب، زندگی اور سماج سے اس کا رشتہ ناگزیر ہے۔

مذکورہ کتاب کی نوعیت اور خصوصیت تذکرے کی بھی ہے۔ اس میں شعراء کی سوانح، خاکے اور شاعری پر تبصرے بھی کئے گئے ہیں۔ چند اہم شعراء کا ذکر پہلی مرتبہ اس کتاب کی زینت بنا ہے۔ اس سلسلے میں قدیم تذکروں، کتابوں، مخطوطات، قلمی بیاضیں، رسائل و جرائد، کتب خانے، انٹرویو اور بالمشافہ گفتگو اور ملاقات کے ذریعے مواد جمع (Collective Research) کرنے کی بھرپور سعی شبانہ نکہت انصاری نے کی ہے۔ تحریر کی قلم بندی میں ہر مقام پر اعتدال و توازن (Critical Balanced) کو برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔



کتاب : باب دکن برہان پور
مصنفہ : شبانہ نکہت انصاری
قیمت: ۱۰۰ روپئے
مبصر: وسیم افتخار

تذکرہ تاریخ کی تشکیل و ترتیب میں معاون و مددگار رہتا ہے۔ لہٰذا اِس عنوان کے تحت تحقیق کا نیا باب روشن ہوگا۔ اہل تحقیق کے علاوہ قاری، عوام اور سماج کے بھی سلسلۂ میرؔ کے شعراء کی شاعری سے مستفیض و مستفید ہونے کے قوی امکانات ہیں۔ حسرتؔ موہانی نے تقریباً تمام مشہور شعراء کے تلامذہ اور سلسلے پر کام کیا ہے، سوائے میرؔ کے۔ اس طرح حسرتؔ کی حسرت بھی پایۂ تکمیل کو پہنچے گی۔ اس لئے یہ تحقیقی کتاب شاعری، ادب، تحقیق، تنقید، تاریخ، تہذیب، ثقافت اور اِن سے متصل سماج کے لئے سودمند ثابت ہوگی۔

چنان چہ کتاب 'باب دکن برہان پور: ایک سیاسی، سماجی، ثقافتی اور ادبی بازیافت' مواد، موضوع کے لحاظ سے تحقیق کا حق ادا کرتی ہے۔ مصنفہ کافی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی ہیں۔

◆◆◆

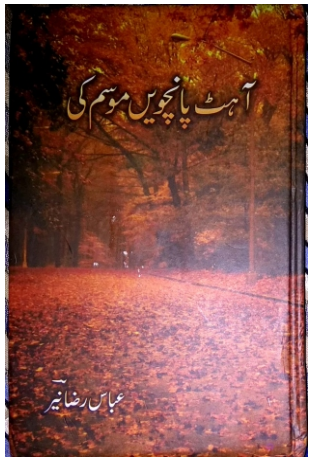
زیرِ تبصرہ کتاب ڈاکٹر عباس رضانیّر (صدر شعبۂ اُردو، لکھنؤ یونی ورسٹی، لکھنؤ) کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔اس مجموعے میں 199 غزلیں اور نظمیں شامل ہیں (نظمیں آزاد اور پابند کی ہیئت میں ہیں، یہ نظمیں جدید یت کی علم بردار ہیں، کچھ نظمیں چار، پانچ اور چھ مصروعوں اور کچھ نظمیں آٹھ مصرعوں پر مشتمل ہیں)۔ڈاکٹر عباس رضانیّر نے ''دریچہ'' (جسے مقدمہ یا پیش لفظ کہنا مناسب ہوگا) عنوان کے تحت اپنے دل کی باتیں قارئین سے نثری نظم کے انداز میں Share کی ہیں۔''جب قاری ''دریچہ'' کا مطالعہ کرتا ہے تو نیّر صاحب کی نثری باتوں کی چاشنی اور طرز ادا کی کشش میں اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ اسے معلوم ہی نہیں ہو پاتا کہ دریچے کے دس صفحات کب مکمل ہو گئے۔اس مقدمے کی خاص بات یہ ہے کہ موصوف نے قدیم نثری لب و لہجے اور اسلوب کو اختیار کر اسے با اثر و بہ معنی شکل عطا کی۔قدیم لکھنوی انداز نگارش کا رنگ اس مقدمے میں جا بجا دکھائی دیتا ہے۔اس مقدمے کے ذریعے ڈاکٹر عباس رضانیّر کی نثری صلاحیتوں کے نئے باب دریچوں سے باہر آئے ہیں۔''دریچے'' میں عباس رضانیّر نے اپنے ادبی حالات کے ساتھ اُن پریشانیوں کو بھی قلم بند کیا ہے جن سے موصوف کا سابقہ طالب علمی کے زمانے میں اپنے آبائی وطن قصبہ جلال پور ضلع امبیڈکر نگر (یوپی) سے لکھنؤ آنے تک کے سفر میں ہوا۔اپنی پہلی ملازمت پیتل نگری مراد آباد میں کرنے اور وہاں کے لوگوں کے خلوص، مہمان نوازی اور ایثار و قربانی کے جذبے کا تذکرہ بھی ببانگ دہل کیا ہے۔اس تعلق سے ان کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

میں دیا ہوں مجھے بجھائے گی
اے ہوا سانس پھول جائے گی
گھر سے نکلوگے تم رستوں میں
دھوپ سائے بچھاتی جائے گی

موصوف نے اس بات کا اعتراف بڑی طمانیت کے ساتھ کیا کہ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں ان کے نانا اور دادا کیفؔ جلال پوری (دونوں مرحوم) کا کیا کردار رہا ہے۔ساتھ ہی موصوف نے اپنے والد محترم کی اس دیرینہ خواہش کا بھی احترام کیا ہے کہ ''اپنی زندگی میں کتابوں کی اشاعت کرو تا کہ آنے والی نسل ان کتابوں میں اپنے اجداد کی کاوشوں کو تلاش کرے۔'' موصوف نے اس شعری مجموعے میں اپنی زندگی کے چار موسموں (سردی، گرمی، برسات اور موسمِ بہار) پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔دریچہ، ویسے تو نثری نظم میں تحریر کیا گیا ہے لیکن اس میں بھی وہی لطف اور نغمگی ہے جو موصوف کی غزلوں اور نظموں میں موجود ہے۔اپنی بات کو موصوف نے کتنے دل کش انداز میں بیان کیا ہے اس کا اندازہ ایک اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

''موجۂ خونِ جگر تو ہی بتا!....لوحِ دل پر نئے حالات، نئے عہد، نئے درد کا ماتم لکھوں....زندگی تجھ کو سجانے کے لیے دنیا میں۔چار موسم ہیں یقیناً لیکن ، جانے کیوں ہوتا ہے محسوس کہ انسانوں سے، چاروں موسم ہی خفا ہوں جیسے۔کسی موسم کی کسی شاخ، کسی پھول، کسی پتّے پر، کوئی بھی رنگ نہیں کھلتا ہے۔آنچ دیتا ہوا احساس سوالی ہے کروں کیا آخر.....؟ دھوپ کو شبنم لکھوں....؟ یا کوئی پانچواں موسم لکھوں.....؟

(آہٹ پانچویں موسم کی، عباس رضا نیر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2016 صفحہ 14 تا 15)



کتاب : آہٹ پانچویں موسم کی
شاعر : عباس رضانیر
قیمت: ۲۰۰ روپے مبصر: ابراہیم افسر

اب میں عباس رضانیّر کے شعری مجموعے ''پانچویں موسم کی آہٹ'' پر گفتگو کرنا چاہوں گا۔ان کی غزلوں میں زندگی کی بے ثباتی اور لاابالی کے ساتھ زندگی میں ابھرنے والے مختلف رنگوں پر بھی بات کی گئی ہے۔غزل میں عشق و معشوق کی بات نہ کی جائے تو وہ شاعری بے معنی و بے مطلب سی لگتی ہے، عشقیہ شاعری کے بغیر غزل کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔اپنی غزلوں میں عباس رضانیّر نے بھی عشق کو اپنے خاص انداز میں استعمال کیا ہے۔تقدس اور پاکیزگی کے ساتھ اپنے محبوب کا تذکرہ، پھر آداب و گفتگو میں نفاست و نزاکت اور اپنے محبوب سے نہ مل پانے کے

عوض میں رات بھر نیند نہ آنے کی شکایت انکے اشعار میں جا بجا نظر آتی ہے۔ان کے اس انداز پر قاری واہ اور آہ کرنے پر مجبور ہے۔چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

یہ میرا عشق لے کر آ گیا مجھ کو کہاں نیّر
کہ میرے چاند کو گھیرے ہیں ہالے آیتوں والے

◆◆◆

عشق کے بھی ادب آداب ہوا کرتے ہیں
گفتگو تجھ سے کرے وہ جسے اُردو آئے

◆◆◆

تری چشمِ کرم نے یوں لاج رکھی ہے
مرے چوگرد ہیں مکڑی کے جالے آیتوں والے

◆◆◆

اپنی غزلوں کی طرح عباس رضا نیر نے نظموں میں بھی عشق سے متعلق نئے سوال قائم کیے۔جب عشق میں ناکام ایک لڑکی مندر میں بھگوان کے سامنے اپنی عشقیہ منت مانگنے آئی ہے تو شاعر نے مندر میں آئی لڑکی سے معصوم اور خاص طرز ادا سے بے ساختہ ''سوال'' نامی نظم میں یہ سوال کیا:

کبھی نہ پوجا کرنے والی
لڑکی کو مندر میں دیکھ کے
اس نے پوچھا
آج یہاں
تم؟
کس سے ملنے آئی ہو؟

عباس رضا نیر نے اپنی نظموں اور غزلوں میں ملک کے سامنے در پیش نا مساعد حالات کا بھی خوب تذکرہ کیا ہے۔گنگا جمنی تہذیب کے پاسبانی ان کی نظموں میں بہ درجہ اتم موجود ہے۔موصوف ہندوستان میں پنپنے والی مذہبی فرقہ واریت کے سخت خلاف ہیں۔ہندوستان کے امن چین میں خلل ڈالنے اور بھائی چارے کی مالا کو تار تار کرنے کے وہ خاکی اور کھادی کو قصوروار مانتے ہیں۔موصوف ملک میں امن وامان کا ماحول دیکھنا چاہتے ہیں لیکن جب حالات میں سیاست داں کشیدگی اور زہر گھولنے کی ناکام کرتے ہیں،تب شاعر کا دردمند دل ان کشیدہ اور عہد حاضر کو متاثر کرنے والے پُر خطر حالات پر ''کھیل سیاست کا'' نظم کہنے پر مجبور ہے:

گائے پھر کوئی زخمی ہوگی
انسانوں کا خون بہے گا
گیتا اور قرآن جلیں گے
ڈاڑھی اور چوٹی کی سازش
کھدر اور خاکی کی لغزش
ایک جنگل آباد کرے گی
شہروں کو بر باد کرے گی

اس مجموعے میں عباس رضا نیر نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو بروے کار لاتے ہوئے بہترین EcoSystem پر بھی غزلیں کہیں ہیں۔یہ غزلیں موصوف کا ماحولیات سے لگاؤ اور شغف کی جانب اشارہ ہے۔جون ایلیا سے محبت کے سبب انھوں نے نذرِ جونؔ ایلیا نظم تخلیق کی۔اپنی والدہ محترمہ کے نام شاعرانہ انداز میں ''ایک چٹھی ماں کے نام'' تخلیق کی۔ماں کی ماتا اور اس رشتے کی اہمیت کو وہی انسان پہچان سکتا ہے جس نے اپنی ماں کی ماتا کو نہیں دیکھا یا ماں کے آنچل کا سایہ پانے سے محروم رہ گیا ہو۔عالمی تناظر میں ڈاکٹر عباس رضا نیر نے ''فلسطین،مزائل اور ماں'' نامی نظم کے ذریعے ماں بیٹے کے رشتوں کو صفحۂ قرطاس پر لکھا۔اس نظم میں اپنے بیٹے کی شہادت کو دل دوز اور ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ویسے ڈاکٹر عباس رضا نیر کی شناخت اُردو ادب میں ایک ناقد اور محقق کی ہے،لیکن اس شعری مجموعے کی اشاعت سے ان کی پہچان ایک شاعر کے طور پر مسلم ہو جائے گی۔عہد جوانی میں میں موصوف نے مشاعروں میں اپنا کلام بھی خوب پیش کیا ہے۔اس مجموعے کے ظہور سے واقعی ہمیں ''پانچویں موسم کی آہٹ'' سنائی دیتی ہے۔

◆◆◆

آپ کے خطوط

مکرمی جناب سلیم احمد صاحب! تسلیمات

امید کرتا ہوں کہ آپ بخیر ہوں گے۔ سب سے پہلے تو آپ کے نئے رسالے پر آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ میں نے پہلا شمارا پی .ڈی.ایف. کی شکل میں دیکھا۔ انور ظہیر، حقا القاسمی، مشیر احمد، غلام حسین وغیرہ کی تحریریں کافی معیار ہیں۔ انور ظہیر صاحب کا یہ مضمون کافی پرانا ہے۔ یہ میں پہلے ہی پڑھ چکا ہوں اور اقبال پر منعقدہ ایک سیمینار میں بھی سن چکا ہوں۔ آپ نے اچھے اور معیاری افسانے بھی شامل کیے ہیں۔ عشرت ناہید آج کل خوب لکھ رہی ہیں اور اچھا لکھ رہی ہیں۔ غزلوں کا حصہ بھی بہتر ہے۔ رسالے میں اچھی بات یہ ہے کہ آپنے ملک کے سبھی علاقوں، حصوں سے قلمکاروں کو جگہ دی ہے جو ایک معیاری رسالے کے لیے ضروری ہے۔ ''ادبی نشیمن'' کے لیے نیک خواہشات اور اس کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔ آپ کے رسالے کے لیے ایک غیر مطبوعہ مضمون پیش ہے۔ اگر آپ کے معیار پر پورا اترے تو شامل اشاعت کر لیں۔ شکر گزار ہوں گا۔ اگر کسی وجہ سے آپ نہ شایع کر سکیں تو مجھے ای میل سے اطلاع کر دیں تا کہ میں اس مضمون کو کہیں اور بھیج سکوں۔

بہت بہت شکریہ

عبدالحی۔ ذاکر نگر، نئی دہلی

موبائل نمبر 8899572095

محترم مدیر.....

ڈاکٹر سلیم احمد جیسے نقاد، ادیب و افسانہ نگار و معتبر صحافی کی ادارت میں ماہ دسمبر ۲۰۱۷ سے جاری سہ ماہی ''ادبی نشیمن'' دنیا ئے اردو زبان و ادب میں ایک گراں قدر و قیمتی اضافہ ہے۔ کوئی تخلیق، تالیف یا اشاعتی ادارہ بہ آسانی منظر عام پر نہیں آتا، محنت شاقہ، ذہانت، مستقبل مزاجی اور جدو جہد کے بعد تخلیقات کی تلاش و تعین، نیز کمپوزنگ، پروف ریڈنگ، طبا عت و ترسیل کے مختلف و دشوار گزار مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور سب سے اہم اور ضروری عنصر ہے مقدور بھر پیسہ اپنی مالی تعاون۔ جس کے بغیر کچھ ممکن نہیں اور جس کا حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ''ادبی نشیمن'' کے آغاز اور اسے اسم با مسمیٰ بنانے کے لیے آپ کی خدمت میں دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ بحر حال! ''ادبی نشیمن'' کا سرورق زیادہ حسین و مرصع ہے یا کہ آخری ورق پر دستاویز...؟ یہ فیصلہ میں نہیں کر سکا لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ دونوں خوب سے خوب تر ہیں۔ قریب قریب تمام مضامین و غزلیں معیاری ہیں۔ اداریہ نہ صرف حکومتکو آئینہ دکھاتا ہے بلکہ نام نہا د اردو اخبارات اور خود ساختہ اردو داں کو بھی.....

ندیم راعی، مرادآبادی

مدیر اعلیٰ آئینہ راعین، مرادآباد

उर्दू त्रैमासिक RNI NO. UPURD/2017/74845

वर्ष : 01 अंक 02
मार्च–मई 2018

अदबी नशेमन

लखनऊ – 226 003

मूल्य : 20 रु./–
वार्षिक मूल्य : 70 रु./–



اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک کو ادبی نشیمن کا پہلا شمارہ پیش کرتے ہوئے

ایڈیٹر ڈاکٹر سلیم احمد (بائیں) ادبی مشیر رفعت عزمی (دائیں) اور سابق ایڈیٹر 'نیا دور' ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی



سہ ماہی ادبی نشیمن کا اجراء کرتے ہوئے پروفیسر شارب ردولوی

ساتھ میں مرزا شفیق حسین شفق، ڈاکٹر سلیم احمد 'ایڈیٹر' (دائیں)، رفعت عزمی، 'ادبی مشیر' احمد رشیق اور غفران نسیم (بائیں)

प्रकाशक व मुद्रक, अहमद रशीक, नोमानी प्रिन्टिग प्रेस बारूदखाना, गोलागंज, लखनऊ से
मुद्रित एवं 544 सी / 168 अलमास बाग,हरदोई रोड़ लखनऊ से प्रकाशित सम्पादक, डॉ0 सलीम अहमद